Learn-Islam

تقدیم

(۱۹۸۳ء)

حسنِ اتفاق سے یکم محرم الحرام ۱۴۰۲ھ یعنی پندرھویں صدی ہجری کے دوسرے سال کا ''نوروز'' جمعہ کا دن تھا۔ اس مناسبت سے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے مسجد دارالسلام' باغِ جناح' لاہور میں اپنے خطابِ جمعہ میں جو اہم باتیں ارشاد فرمائیں وہ ماہنامہ ''میثاق'' میں ''ہجری سالِ نومبارک'' کے عنوان سے شائع ہوگئی تھیں۔

پھر اسی سال ۸/محرم الحرام کو ڈاکٹر صاحب نے ''سانحہ کربلا کا تاریخی پس منظر'' کے عنوان سے مفصل خطاب فرمایا جو 'میثاق' بابت دسمبر ۱۹۸۱ء میں شائع ہوگیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی واقعاتِ کربلا کے ضمن میں ایک طویل روایت کا ترجمہ بھی شائع کر دیا گیا تھا جو حضرت زین العابدین علیؒ بن حسینؓ کے صاحبزادے اور حضرت جعفر صادقؒ کے والد ماجد حضرت محمد باقرؒ سے مروی ہے۔

''میثاق'' کی اس اشاعت کی مانگ بہت زیادہ ہوئی تھی' یہاں تک کہ اب اس کا کوئی نسخہ دفتر میں موجود نہیں ہے۔ چنانچہ احباب کے تقاضوں کے پیشِ نظر اب ان تینوں کو یکجا کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔

توقع ہے کہ ان شاء اللہ العزیز یہ کتابچہ ان مغالطّوں اور غلط فہمیوں کے ازالے میں ممد و معاون ثابت ہوگا جو ماہ محرم الحرام اور شہادتِ سیّدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ضمن میں عوام و خواص میں پائی جاتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو حق کو پہچاننے اور اسے ذہناً وقلباً قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

ناظم نشر و اشاعت

ہجری سالِ نو مبارک

۳۰/اکتوبر ۱۹۸۱ء کو جمعہ کا دن اور محرم الحرام ۱۴۰۲ھ کی یکم تاریخ تھی۔ اس روز مسجد دار السلام باغ جناح' لاہور میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنے خطابِ جمعہ میں جو موضوع گزشتہ دو ماہ سے چل رہا تھا یعنی "نظامِ سیاست و حکومت سے متعلق قرآنی تعلیمات" اُس پر گفتگو سے قبل نئے ہجری سال کے آغاز کی مناسبت سے جو کچھ فرمایا' وہ درج ذیل ہے۔ (مرتب)

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ ۔ اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ...... بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ فِيْ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ : ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾﴾

وَقَالَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى فِيْ سُوْرَةِ آلِ عِمْرَانَ: ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾﴾

اَمَّا بَعْدُ: ﴿رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ۝ وَيَسِّرْ لِيْ اَمْرِيْ ۝ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ۝ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ۝﴾

اَللّٰهُمَّ اَهِلَّهٗ عَلَيْنَا بِالْاَمْنِ وَالْاِيْمَانِ وَالسَّلَامَةِ وَالْاِسْلَامِ

اَللّٰهُمَّ مَنْ اَحْيَيْتَهٗ مِنَّا فَاَحْيِهٖ عَلَى الْاِسْلَامِ ؕ وَمَنْ تَوَفَّيْتَهٗ مِنَّا فَتَوَفَّهٗ عَلَى الْاِيْمَانِ ...... آمِيْنَ يَا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ!

حضرات! آج یکم محرم الحرام سن ۱۴۰۲ ہجری ہے۔ گویا آج پندرہویں صدی کے دوسرے سال کا پہلا دن ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے تو میں اسلامی تقویم کے اعتبار سے اس نئے سال کی آمد پر آپ کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ یہ سال ہمارے لئے امن و امان اور سلامتی و اسلام کا سال ثابت ہو۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے آغاز میں وہ دعا پڑھی ہے جو نبی کریم ﷺ ہر ماہ کے لئے نئے چاند کے طلوع ہونے پر پڑھا کرتے تھے یعنی اَللّٰهُمَّ اَهِلَّهٗ عَلَيْنَا بِالْاَمْنِ وَالْاِيْمَانِ وَالسَّلَامَةِ وَالْاِسْلَامِ جس کے آخر میں آنحضرت ﷺ یہ بھی فرمایا کرتے تھے: "رَبِّيْ وَرَبُّكَ اللّٰهُ ۔ هِلَالُ رُشْدٍ وَّخَيْرٍ" اس دعا کے تین حصے ہیں۔ اصل دعا تو پہلا حصہ ہے کہ "اے اللہ! اس چاند کو ہم پر امن و ایمان اور سلامتی و اسلام کے ساتھ طلوع فرما"۔ دوسرے حصے میں چاند سے خطاب ہے۔ اس میں دراصل مشرکانہ اوہام اور عقائد کی نفی اور ابطال ہے جو چاند' سورج اور اجرامِ فلکیہ کے بارے میں بالعموم لوگوں کے ذہنوں میں پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا آنحضرت ﷺ یہ فرمایا کرتے تھے: رَبِّيْ وَرَبُّكَ اللّٰهُ یعنی "میرا رب بھی اللہ ہے اور اے چاند تیرا رب بھی اللہ ہے"۔ تیسرا حصہ ایک نوید اور خوشخبری بھی ہے اور اس میں ایک دعائیہ پہلو بھی ہے: هِلَالُ رُشْدٍ وَّخَيْرٍ یعنی یہ ہلال جو طلوع ہوا ہے یہ رشد اور خیر کا ہلال ہے۔ یہاں "ہے" بھی ترجمہ ہو سکتا ہے اور "ہو" بھی ترجمہ ہو سکتا ہے۔ اگر اوّل الذکر ترجمہ کیا جائے تو یہ نوید و خوشخبری ہے اور اگر مؤخر الذکر ترجمہ کیا جائے تو یہ دعا ایک تمنا اور خواہش کا اظہار ہے —— کل جو ہلال طلوع ہوا ہے اس سے صرف ایک نیا مہینہ ہی شروع نہیں ہوا

بلکہ نیا اسلامی و ہجری سال بھی شروع ہوا ہے۔ لہٰذا ہمیں یہ دعا کرنی چاہئے کہ اے اللہ! اس سال کو نوعِ انسانی کے حق میں بالعموم اور مسلمانانِ عالم کے حق میں بالخصوص اور اس خطۂ ارضی کے حق میں جو تو نے اسلام کے نام پر ہمیں عطا فرمایا تھا اور جو مملکتِ خداداد پاکستان کہلاتا ہے' خاص الخاص طریق پر اپنے فضل اور اپنی رحمت سے امن و سلامتی کا سال بنا اور اس سال میں ہمارے ایمان اور اسلام میں حقیقی رنگ پیدا فرما — میں نے مزید یہ دعا بھی کی ہے کہ اس سال کے دوران تیرے علم کامل میں جن کی وفات کا وقت قریب آ رہا ہو' اے اللہ! ان کو ایمان پر وفات دیجیو اور جن کے لئے تیرے علمِ ازلی میں مزید مہلت عمر طے ہو ان کو اسلام پر قائم رکھیو — اَللّٰھُمَّ مَنْ اَحْیَیْتَہٗ مِنَّا فَاَحْیِہٖ عَلَی الْاِسْلَامِ وَمَنْ تَوَفَّیْتَہٗ مِنَّا فَتَوَفَّہٗ عَلَی الْاِیْمَانِ۔

اس موقع پر ایک جملہ معترضہ کے طور پر مجھے یہ بھی عرض کرنا ہے کہ محرم الحرام کے مہینے کو ہم نے ایک مخصوص مکتبِ فکر کے زیر اثر بلا سبب اور قطعی نامناسب طور پر رنج و غم اور حزن و اَلم کا مہینہ بنا لیا ہے' حالانکہ کسی بھی اعتبار سے یہ مہینہ ہمارے لئے رنج و غم کا مہینہ نہیں ہے' بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سال کا کوئی مہینہ بھی دینی لحاظ سے رنج و غم کا مہینہ نہیں ہے۔ یوم عاشوراء (۱۰ محرم الحرام) کی جو اہمیت ہمارے ہاں ہے' اس میں ہمارے دینی تصورات و عقائد کے لحاظ سے عظمت کا پہلو ہے۔ اس ضمن میں بہت سی احادیثِ صحیحہ کتب احادیث میں موجود ہیں۔ نبی اکرم ﷺ اس دن جو روزہ رکھتے تھے تو اس کی کوئی بنیاد اور تعلق حادثہ کربلا سے نہیں ہے۔ یہ حادثہ تو نبی اکرم ﷺ کی الرفیق الاعلیٰ کی جانب مراجعت کے نصف صدی سے بھی زائد بعد پیش آیا ہے۔ لہٰذا دینی لحاظ سے اس حادثے کا یوم عاشوراء سے کسی تعلق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صومِ عاشوراء کے متعلق جو متفق علیہ حدیث ملتی ہے یعنی سند کے اعتبار سے جس کی صحت پر امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ جیسے جلیل القدر محدثین اتفاق کر رہے ہوں اور جس کے راوی ہیں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما' جو آنحضرت ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ دونوں کے چچازاد بھائی ہیں اور جو گویا حضرات حسنین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے رشتے کے چچا بھی ہیں اور نانا بھی۔ وہ روایت کرتے ہیں کہ جب آنحضرت ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے اور آپؐ نے دیکھا کہ مدینہ کے یہود ۱۰ محرم الحرام کو روزہ رکھتے ہیں تو آپؐ نے یہود سے دریافت فرمایا کہ ''تم یہ روزہ کیوں رکھتے ہو؟'' انہوں نے بتایا کہ ''یہ دن ہمارے لئے بڑی خوشی کا دن ہے' اس لئے کہ اسی دن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو آلِ فرعون کے ظلم و استبداد سے نجات دلائی تھی اور فرعون اور اس کے لشکر کو' جو تعاقب میں تھا' غرق کیا تھا' لہٰذا ہم شکرانے کے طور پر یہ روزہ رکھتے ہیں''۔ اس پر آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''تمہاری نسبت (حضرت) موسیٰؑ کے ہم زیادہ حق دار ہیں''۔ یہود نے تو اس کو ایک قومی دن کا درجہ دے رکھا ہے' حالانکہ یہ دن دینِ اسلام کی تاریخ کا ایک تابناک باب ہے اور دینِ اسلام کی تاریخ تو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوتی ہے۔ اسی موقع پر آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ ''ہم اس دن کا روزہ رکھنے کے زیادہ حق دار ہیں''۔ چنانچہ اس وقت سے آنجنابؐ نے دس محرم الحرام کا روزہ رکھنا شروع فرما دیا۔

ویسے بھی اس بات کو اچھی طرح جان لیجئے کہ ہمارے دین میں ''شہادت'' کا معاملہ کوئی رنج و غم والی بات ہے ہی نہیں' بلکہ یہ تو ایک مردِ مومن کے لئے فوز و مرام اور فلاح و کامرانی کا بلندترین اور ارفع و اعلیٰ مقام ہے۔ دلیل کے لئے سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۵۴:

﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝﴾

یعنی ''جو اللہ کی راہ میں قتل کئے جائیں انہیں مردہ نہ کہو' بلکہ یہ لوگ (تو حقیقت میں) زندہ ہیں مگر تمہیں ان کی زندگی کا شعور حاصل نہیں''۔

اور سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۶۹:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ﴾

یعنی ''جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں ان کو مردہ خیال نہ کرو بلکہ وہ زندہ ہیں۔ اپنے ربّ کے پاس سے روزی پا رہے ہیں'' کو پیش نظر رکھئے۔ ان مقتولین کی برزخی زندگی میں حیات اور اس میں رزق پانے کی کیفیات امورِ غیب سے متعلق ہیں لہٰذا اس کا کوئی تصور وشعور اس عالمِ ناسوت میں ہمارے لئے ممکن نہیں۔

شہادت فی سبیل اللہ وہ سعادتِ عظمیٰ اور چوٹی کا وہ عمل ہے کہ جس کے لئے انبیاء ورسل علیہم السلام تمنا کیا کرتے تھے۔ چنانچہ صحیح احادیث میں آنحضرت ﷺ کی دو دعائیں منقول ہیں۔ ایک یہ کہ:

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ شَهَادَةً فِيْ سَبِيْلِكَ

اور دوسری یہ کہ:

اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِيْ شَهَادَةً فِيْ سَبِيْلِكَ

مزید برآں آنحضور ﷺ کا یہ قول بھی احادیث میں منقول ہے:

((لَوَدِدْتُ اَنِّيْ اُقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ اُحْيَا ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْيَا ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْيَا ثُمَّ اُقْتَلُ)) (متفق عليه)

''میرے دل میں بڑی آرزو اور بڑی تمنا ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں' پھر مجھے زندہ کیا جائے' پھر قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جاؤں' پھر قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر قتل کیا جاؤں''۔

اللہ تعالیٰ کی یہ سنت رہی ہے کہ رسول قتل نہیں ہوتے' اس لئے کہ اس طرح عالم ظاہری میں رسول کی مغلوبیت کا پہلو نکلتا ہے' لیکن اس حدیث سے مرتبۂ شہادت کے رفیع ومہتم بالشان ہونے کا اندازہ لگا لیجئے—— علاوہ ازیں نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشادِ گرامی بھی ملاحظہ کیجئے:

((مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَغْزُ وَلَمْ يُحَدِّثْ بِهٖ نَفْسَهٗ مَاتَ عَلٰى شُعْبَةٍ مِنَ النِّفَاقِ)) (مسلم و ابوداوٗد)

''جس مسلمان کی موت اس حال میں آئی کہ نہ اس نے کبھی اللہ کی راہ میں جنگ کی اور نہ ہی اس کے دل میں راہ حق میں سر کٹا کر سرخرو ہونے کی تمنا وآرزو پیدا ہوئی' اس کی موت ایک قسم کے نفاق پر واقع ہوئی''۔

پس شہادت ہرگز رنج والم' سوگ اور ماتم کرنے والی چیز نہیں ہے۔

اگر شہادت رنج وغم اور الم و ماتم والی شے ہوتی تو دورِ نبویؐ اور دورِ خلافتِ راشدہ کی تاریخ میں شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا ہو جس میں کوئی نہ کوئی عظیم شہادت وقوع پذیر نہ ہوئی ہو۔ اگر شہادت میں رنج وغم اور ماتم کا پہلو تلاش کریں تو حضرت سمیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شہادت کا دن بھی ماتم کے دن کے طور پر منانا ہوگا۔ یہ بڑی عظیم شہادت ہے۔ توحید کے لئے یہ پہلا خون بہا ہے جس سے مکہ مکرمہ کی زمین لالہ زار ہوئی اور کس بہیمانہ طریقے پر کہ ابوجہل نے تاک کر اندام نہانی پر نیزہ مارا ہے جو پشت کے پار ہو گیا۔ پھر ان کے شوہر حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کی عظیم شہادت ہے جس کے متعلق بعض روایات میں آتا ہے کہ ابوجہل اور اس کے شقی القلب ساتھیوں نے حضرت یاسرؓ کے دونوں ہاتھ اور دونوں پیر رسیوں سے باندھے' پھر چہار سمت میں چار اونٹ کھڑے کر کے یہ رسیاں اونٹوں کی ٹانگوں سے باندھ کر ان کو ہانک دیا گیا اور حضرت یاسرؓ کے جسم کے پرخچے اڑ گئے۔ یہ شوہر اور بیوی محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کے جرم میں اس ظالمانہ طور پر شہید کئے گئے۔ ان کی مظلومانہ شہادت کے واقعات ایک حساس دل کے رونگٹے کھڑے کر دیتے ہیں۔ اگر

ہمیں سوگ اور ماتم کا دن منانا ہوتا تو ان کا مناتے! اگر نبی اکرم ﷺ سے قرابت کی بنیاد پر شہادت کا دن نوحہ وگریہ اور ماتم کا کوئی پہلو رکھتا تو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کا دن اس کا کہیں زیادہ مستحق ہوگا کہ اسے سوگ کا دن منایا جائے جن کے آنحضرت ﷺ کے ساتھ قرابت داری کے تیہرے بلکہ چوہرے رشتے ہیں۔ چنانچہ چچا بھتیجے کا رشتہ بھی ہے' خالہ زاد بھائی بھی ہیں اور رضاعی بھائی بھی ہیں۔ عرب میں رضاعت کا رشتہ بالکل خونی رشتے کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ سب جانتے ہیں کہ اسلام میں نکاح کی حرمت جس طرح رحم اور خون کے رشتوں کی بنیاد پر ہے اسی طرح رضاعت کی بنیاد پر بھی ہے۔ پھر ساتھ کے کھیلے ہوئے ہم جولی ہیں۔ مزید اضافہ کیجئے کہ نبی اکرم ﷺ کے فرمانِ مبارک کے مطابق ''اَسَدُ اللّٰہِ'' بھی ہیں اور ''اَسَدُ رَسُوْلِہٖ'' بھی ہیں۔ پھر نعش مبارک کا حال یہ ہے کہ اعضاء بریدہ (مثلہ شدہ) ہیں' شکم چاک ہے' کلیجہ نکال کر چبانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اب اگر ہر سال سوگ کا دن منایا جاتا اور ماتم کیا جاتا تو ان کی شہادت پر کیا جاتا۔ پھر دیکھئے کہ حضرت زید بن حارثہ' حضرت جعفر طیار بن ابی طالب' حضرت عبداللہ بن رواحہ' حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اور بے شمار دوسرے جاں نثارانِ محمد ﷺ دورِ نبوت میں شہادت کے مرتبے پر فائز ہوئے ہیں۔ سوگ کا دن منایا جاتا تو ان کا منایا جاتا۔ لیکن رنج وغم کی بات کون سی ہے!! اسلام کی تاریخ کا کون سا دور ہے جو ان شہادتوں اور قربانیوں سے خالی ہو؟ اسلام کے گلشن میں ہر چہار طرف یہ پھول کھلے ہوئے ہیں۔

پھر غور فرمائیے کہ اسلامی تقویم کا جو پہلا دن ہر سال آتا ہے' یعنی یکم محرم الحرام تو یہ ایک عظیم شہادت کا دن ہے' یعنی دوسرے خلیفہ راشد امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت کا دن یکم محرم الحرام ہے۔ وہ عمرؓ جن کے متعلق آنحضور ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ ''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتے''۔ اگر رنج وغم کے اظہار کا مسئلہ ہوتا اور اگر سوگ کا دن منانے کا معاملہ ہوتا تو آج کے دن یعنی یکم محرم الحرام ہوتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر قاتلانہ حملہ ۲۸؍ذی الحجہ کو ہوا تھا جس میں آنجناب مجروح ہوئے تھے اور معتبر روایات کے مطابق ان کی وفات یکم محرم الحرام کو ہوئی تھی۔ پھر ۱۸؍ذی الحجہ کو تیسرے خلیفۂ راشد ذوالنورین حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تقریباً پچاس دن کے محاصرے کے بعد انتہائی مظلومانہ طور پر شہید کئے گئے جن کی شہادت کے نتیجے میں مسلمان آپس میں دست وگریباں ہوئے اور اُمت میں ایسا تفرقہ پڑا کہ آج تک ختم نہیں ہوا۔ سوگ کا دن منانا ہوتا تو اس ''شہیدِ مظلوم'' کی شہادت کے دن کو منایا جاتا۔ پھر ۲۱؍رمضان المبارک کو اسداللہ حضرت علی رضی اللہ عنہ' حضور ﷺ کے چچیرے بھائی' آپؐ کے داماد' چوتھے خلیفہ راشد شہید کر دیئے گئے جو حضراتِ حسنین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے والد ماجد بھی ہیں۔ سوگ کا دن منانا ہوتا تو ایک مخصوص مکتبِ فکر کے افراد کے بجائے پوری امت آنجناب کی شہادت کے دن سوگ مناتی۔ اگر سوگ کے دن منانے کا سلسلہ جاری رہے تو بتائیے کون کون سے دن سوگ منایا جائے گا؟ سال کا کون سا دن ہوگا جو کسی نہ کسی عظیم شخصیت اور اولیاء اللہ کی شہادت یا وفات کا دن نہ ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے دین میں سوگ اور ماتم اور ان کے دن منانے کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ جس گھر میں کسی کی وفات ہوئی ہو تو سوگ کی کیفیت کی زیادہ سے زیادہ تین دن کے لئے اجازت ہے۔ اس میں بھی نوحہ' گریہ اور سینہ کوبی کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔ باقی رہا یہ کہ ان میں سے جنہوں نے بھی اللہ کی راہ میں قربانیاں دی ہیں اور حق وصداقت کے لئے اپنی جانیں دی ہیں' اس کی بنیاد پر ان کا بہت ارفع واعلیٰ مقام ہے۔ لیکن نہ تو دن اور یادگار منانا ہمارے دین کے مطابق ہے' نہ ہی یہ کوئی رنج وغم اور الم وحزن کا معاملہ ہے اور نہ ہر سال سوگ اور ماتم کرنا دین سے کوئی مناسبت رکھتا ہے۔

شاید آپ کو معلوم ہو کہ ہمارے یہاں صوفیاء کے نزدیک موت کو ایک محبوب اور محبّ کی ملاقات کا وقت تصور کیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ جو لفظ ''عرس'' رائج ہے تو اس کے معنی شادی کے ہیں۔ جیسے عرس (شادی) ایک خوشی کا موقع ہوتا ہے ویسے ہی موت کسی مردِ مؤمن کے لئے کسی رنج وغم کا موقع ہے ہی نہیں' چاہے وہ طبعی ہو چاہے قتل کی صورت میں ہو۔ یہ تو درحقیقت ایک محبوب اور محبّ کی ملاقات ہے۔ اس پہلو سے علامہ اقبال کا وہ شعر ذہن میں رکھئے کہ ؎

نشانِ مردِ مؤمن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست!

توتبسم خوشی کے موقع پر ہوتا ہے نہ کہ غمی کے موقع پر۔ پس یہ سوگ اور ماتم کے دن منانا قطعاً ہمارے دین کے ساتھ مناسبت رکھنے والی چیز نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں ہمارے معاشرے میں یہ غلط رواج چلا آ رہا ہے کہ محرم الحرام' بالخصوص اس کے پہلے عشرے میں شادیاں نہیں ہوتیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذی الحجہ کے آخری عشرے میں شادیوں کا ایک طوفان آ جاتا ہے۔ آپ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا کہ امسال ذی الحجہ کے آخری دنوں میں لاہور اور کراچی جیسے شہروں میں روزانہ ہزاروں کی تعداد میں شادیاں انجام پائی ہیں۔ آخر ہم نے محرم الحرام' بالخصوص اس کے پہلے عشرے' کو شادی بیاہ کی تقریب کے لئے حرام یا منحوس کیوں سمجھ لیا ہے!!

سانحۂ کربلا

ڈاکٹر اسرار احمد

کی ایک تقریر

جو موصوف نے محرم الحرام ۱۴۰۲ھ

کو قبل از نماز جمعہ

جامع مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور

میں ارشاد فرمائی

سانحۂ کربلا

نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ ...... بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿یٰاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوۃِ ط اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ ۝ وَلَا تَقُوۡلُوۡا لِمَنۡ یُّقۡتَلُ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَمۡوَاتٌ ط بَلۡ اَحۡیَآءٌ وَّلٰـکِنۡ لَّا تَشۡعُرُوۡنَ ۝ وَلَنَبۡلُوَنَّکُمۡ بِشَیۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَالۡجُوۡعِ وَنَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَنۡفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ط وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیۡنَ ۝ الَّذِیۡنَ اِذَآ اَصَابَتۡھُمۡ مُّصِیۡبَۃٌ لا قَالُوۡٓا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ ۝ اُولٰٓئِکَ عَلَیۡھِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّھِمۡ وَرَحۡمَۃٌ قف وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡمُھۡتَدُوۡنَ ۝﴾ (البقرۃ:۱۵۳ تا ۱۵۷)......صدق اللّٰہ العظیم

ان آیات کی تلاوت اور ادعیۂ مسنونہ کے بعد ڈاکٹر صاحب موصوف نے فرمایا:

’’حضرات! دو دن بعد محرم الحرام ۱۴۰۲ھ کی دس تاریخ ہوگی جو ’’یومِ عاشوراء‘‘ کہلاتا ہے۔ یقیناً یہ بات آپ کے علم میں ہوگی کہ ۱۰ محرم الحرام سن ۶۱ ہجری کو ایک نہایت افسوس ناک حادثہ دشتِ کربلا میں پیش آیا تھا‘ جس میں سبطِ رسولؐ سیدنا حضرت حسین ابن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور آپ کے خانوادے کے اکثر افراد نیز آپؓ کے اعوان و انصار کی کثیر تعداد نے جامِ شہادت نوش فرمایا تھا۔ اس حادثہ کے متعلق یہ بات اچھی طرح سمجھ لی جانی چاہئے کہ یہ اچانک ظہور پذیر ہونے والا حادثہ نہیں تھا بلکہ درحقیقت اسی سبائی سازش کا ایک مظہر تھا جو پورے پچیس سال قبل اس سے بھی کہیں زیادہ افسوس ناک حادثے کو جنم دے چکی تھی‘ یعنی نبی اکرم ﷺ کے دوہرے داماد اور تیسرے خلیفۂ راشد حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کا سانحہ ۱۸/ ذی الحجہ ۳۶ھ کو پیش آیا تھا اور ۱۶/ اکتوبر ۱۹۸۱ء (۱۷/ ذی الحجہ ۱۴۰۱ھ) کے جمعہ کے اجتماع میں‘ میں

نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سیرت اور ان کی شہادت کے تاریخی پس منظر پر کچھ گفتگو کی تھی (۱) جس پر زیادہ دن نہیں گزرے۔ لہٰذا مجھے آج سہولت محسوس ہو رہی ہے کہ واقعۂ کربلا کے بیان کے ضمن میں، مَیں اپنی گفتگو کا تسلسل اسی کے ساتھ جوڑ سکتا ہوں۔

اوّلاً ذہن میں یہ بات تازہ کر لیجئے کہ حق و باطل کی جو کشمکش ازل سے چلی آ رہی ہے، بقول علامہ اقبال ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

اس کے ضمن میں ہمیں تاریخ کا کچھ ایسا نقشہ نظر آتا ہے کہ زیادہ تر غلبہ باطل کا رہا۔ حق کے غلبے کے ادوار بڑے مختصر رہے۔ یہ بھی ایک حقیقتِ کبریٰ ہے کہ جب کبھی حق کا غلبہ ہوا ہے تو باطل نے اسے اپنی آخری شکست تسلیم نہیں کیا بلکہ ایسے مواقع پر وہ وقتی طور پر دبک جاتا رہا ہے۔ اس نے منافقانہ طور پر حق کا لبادہ اوڑھ لیا یا وہ وقتی طور پر زیرِ زمین چلا گیا۔ چنانچہ وہ اندر ہی اندر اپنی ریشہ دوانیوں کا سلسلہ جاری رکھتا ہے اور ایسے موقع کی تاک میں رہتا ہے جب وہ حامیانِ حق کے درمیان کوئی شدید اختلاف و انتشار پیدا کر کے اپنے لئے راستہ بنا سکے اور حق کے خلاف کھڑا ہو سکے۔

چنانچہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تاریخ کا عظیم ترین معجزہ دنیا کو دکھا دیا یعنی ﴿جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ﴾ کا نقشہ بالفعل قافلۂ انسانیت کو چشمِ سر سے دیکھنے کا موقع فراہم فرما دیا اور ایک وسیع و عریض خطۂ زمین پر حق کو بالفعل قائم و نافذ فرما کر رہتی دنیا تک کے لئے ایک کامل نمونہ پیش فرما دیا تو حق غالب اور باطل سرنگوں ہو گیا — لیکن باطل نے انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے آخری مرحلے میں وہی روش اختیار کی کہ وقتی طور پر شکست تسلیم کر کے وہ اس انتظار میں رہا کہ موقع آئے تو میں وار کروں اور کاری وار کروں۔ چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے فوراً بعد فتنوں کا ہجوم اٹھ کھڑا ہوا۔ کئی کاذب مدعیانِ نبوت میدان میں آ گئے اور ان کے ساتھ کافی جمعیت ہو گئی۔ پھر مانعین و منکرینِ زکوٰۃ سے سابقہ پیش آیا اور اہلِ ایمان کو بیک وقت ایسے ایسے عظیم فتنوں سے نبرد آزما ہونا پڑا کہ وقتی طور پر تو محسوس ہوتا تھا کہ حق کا چراغ اب بجھا کہ بجھا! یہ درحقیقت وہ انقلاب دشمن قوتیں (Counter-Revolutionary Forces) تھیں جن سے عہدہ برآ ہونے کے لئے واقعتاً صدیق ہی نہیں بلکہ صدیق اکبر کی شخصیت درکار تھی، رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ۔ صدیق دراصل نبی کا عکس کامل ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ثابت کر دیا کہ جس انقلاب کی تکمیل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفسِ نفیس فرمائی تھی اس کے خلاف آپؐ کی وفات کے بعد جو ردّعمل ظاہر ہوا، اس کی سرکوبی کرنے کی پوری صلاحیت اور عزیمت اور آہنی قوتِ ارادی ان کے نحیف و نزار جسم میں موجود تھی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انقلاب کو مستحکم (Consolidate) کیا اور زمامِ کار حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حوالے کر کے وہ بھی اپنے مالکِ حقیقی کی طرف مراجعت فرما گئے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت، اور جیسا کہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت والی تقریر میں عرض کر چکا ہوں کہ حضرت ذوالنورینؓ کے بارہ سالہ دورِ خلافت میں سے بھی کم و بیش دس سال بالکل دورِ فاروقی ہی کی شان کے حامل تھے، لہٰذا ان کو بھی شامل کر لیجئے تو یہ بیس سال اسلام کے استحکام اور اس کی توسیع کے سال ہیں۔ انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے زیرِ نگیں عراق و شام و فارس (ایران) کے پورے کے پورے ملک اور شمالی افریقہ کا مصر سے مراکش تک کا وسیع علاقہ آ گیا اور اس پر اسلام کا جھنڈا لہرانے لگا اور اللہ کا دین غالب و نافذ ہو گیا۔ اب ظاہر بات ہے کہ اس کے خلاف بھی ایک ردّعمل ہونا تھا۔ یہ جو Historical Process ہے، اس کے کچھ غیر متبدل اصول ہیں۔ آپ کے علم میں ہے کہ جس انقلاب کی تکمیل اندرونِ عرب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفسِ نفیس فرمائی، اس کے ردّعمل میں مخالفانہ تحریکیں (Reactionary Movements) اٹھ کھڑی ہوئیں تو توسیع کا جو مرحلہ آپؐ کے جاں نثاروں کے ہاتھوں انجام پایا، اس کا ردّعمل کیوں نہ ہوتا! چنانچہ باطل نے پہلا وار کیا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ذات

پر۔ باطل پرست یہ سمجھتے تھے کہ شاید یہ پوری عمارت اسی ایک ستون پر کھڑی ہے' اس کو گرادو تو عمارت زمین بوس ہو جائے گی۔ الحمد للہ کہ ان کی توقع غلط ثابت ہوئی اور عمارت برقرار رہی۔ یہ خالص ایرانی سازش تھی۔ ابولؤلؤ فیروز پارسی ایرانی غلام اور اس کی پشت پر ہرمزان ایک ایرانی جرنیل تھا۔

اس سازش کی ناکامی کے بعد جو دوسرا وار ہوا' وہ بہت کاری وار تھا۔ اس میں یہود کی عیاری اور کیادی شامل تھی۔ ان کا سازشی ذہن اور اس میں مہارت ضرب المثل بن چکی ہے۔ عبداللہ بن سباء یمن کا ایک یہودی اٹھتا ہے' اسلام کا لبادہ اوڑھتا ہے' مدینہ منورہ میں آ کر قیام کرتا ہے اور نئے شگوفے چھوڑنے شروع کر دیتا ہے۔ کہیں محبتِ آلِ رسولؐ کے پردے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے متعلق وسوسہ اندازی کرتا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے استحقاقِ خلافت کا پروپیگنڈا کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے اور وہی خلافت کا حق دار ہوتا ہے' تو اصل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں لہٰذا خلافت کے حق دار وہ ہیں۔ ان کی بجائے جو بھی مسندِ خلافت پر فائز ہوا یا اب ہے' وہ غاصب ہے۔ کہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی الوہیت کے عقیدے کا پرچار کرتا ہے جس سے اسلام کی جڑ ''توحید'' پر کاری ضرب لگتی ہے۔ ایرانی نومسلم جن کی گھٹی میں نسلاً بعد نسلٍ شاہ پرستی اور Hero Worship پڑی ہوئی تھی اور جو نسب کی بنیاد پر اقتدار کی منتقلی کے خوگر تھے' ان پر اس کا کتنا گہرا اثر ہوا ہوگا! —— کہیں بظاہر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت بیان کرنے کے لئے یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ جب حضرت مسیح علیہ السلام کا نزولِ ثانی ہوگا تو ہمارے رسولؐ جو افضل الانبیاء ہیں' وہ بھی دوبارہ واپس تشریف لائیں گے —— اب دیکھئے کہ غیر عرب نومسلم خوش عقیدہ لوگوں کے دلوں کو یہ بات کتنی بھانے والی ہے کہ اس طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کا بیان ہو رہا ہے۔ یہی حربہ ہے جو اس دور میں قادیانیوں نے استعمال کیا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے اور ان کے نزول کے عقیدے کی نفی کرنے کے لئے انہوں نے اسی دلیل کا رخ اس طرف رکھا کہ اس طرح تو ہمارے رسولؐ کی عظمت مجروح ہوگی' یہ کیسے ممکن ہے کہ ہمارے نبیؐ تو فوت ہو گئے ہوں اور حضرت مسیح علیہ السلام آسمان پر زندہ موجود ہوں اور دوبارہ تشریف لائیں! گویا اصل بات یہی ہے کہ عوام الناس کی اکثریت عقیدت کی بنیاد پر اس قسم کے مغالطوں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ ان باتوں نے سادہ لوح لوگوں کے ذہنوں اور دلوں میں گھر کرنا شروع کر دیا۔ یہ شخص مدینہ سے بصرہ گیا' وہاں بھی اس نے اپنا ایک مرکز قائم کیا۔ پھر کوفہ گیا' وہاں اس نے اپنا ایک مرکز قائم کیا۔ دمشق جا کر وہاں کوشش کی لیکن وہاں دال نہ گلی۔ پھر مصر گیا' وہاں اپنے ہم خیالوں کی ایک جماعت پیدا کی۔ یوں ہر طرف اس نے ایک فتنہ وفساد کی فضا پیدا کر دی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کے آخری دو سال اس فتنہ وفساد کی نذر ہو گئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ امامِ مظلوم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی جو تاریخ انسانی کی عظیم ترین مظلومانہ شہادت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ وہ اس وقت عظیم ترین مملکت کے فرماں روا تھے' لاکھوں کی تعداد میں فوجیں موجود تھیں جو ان کے اشارے پر کٹ مرنے کے لئے تیار تھیں' جب مٹھی بھر باغیوں نے اس شہیدِ مظلوم کا محاصرہ کر رکھا تھا تو مختلف صوبوں کے گورنروں کی طرف سے استدعا آ رہی تھی کہ ہم کو اجازت دیجئے کہ ہم فوجیں لے کر حاضر ہو جائیں اور ان باغیوں کی سرکوبی کریں' لیکن وہ امامِ وقت یہ عزم کئے ہوئے تھے کہ میں اپنی جان کی حفاظت و مدافعت میں کسی کلمہ گو کا خون بہانے کی اجازت نہیں دوں گا۔ اتنی عظیم قوت وسطوت کا حامل اور اس طرح اپنی جان دینے کے لئے آمادہ ہو جائے اور اپنی جان کی حفاظت و مدافعت میں کسی کا خون بہانے کے لئے تیار نہ ہو' واقعہ یہ ہے کہ پوری تاریخِ انسانی میں اس کی کوئی مثال ممکن نہیں ہے۔ یہ بات بھی جان لیجئے کہ ہمارے ہاں شاعری میں بے پناہ مشرکانہ اوہام موجود ہیں۔ غلط فکر اور عقیدوں کی ترویج میں شاعری نے بہت حصّہ لیا ہے۔ ایسے اشعار زبان زدِ عوام و خاص ہو جاتے ہیں جن میں غلو بھی ہوتا ہے اور غلط فکر بھی۔ شعراء کے متعلق قرآن حکیم نے یہ دوٹوک بات فرما دی ہے کہ:

﴿وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُوْنَ ۞ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۞﴾

''اور شعراء کی بات تو یہ ہے کہ ان کے پیچھے تو بہکے ہوئے لوگ چلا کرتے ہیں۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے ہیں۔''

محتاط ترین لوگ بھی جب شاعری کی ترنگ میں آتے ہیں تو ان کی زبان وقلم سے بھی غیر محتاط اور غلط باتیں نکل جاتی ہیں۔ مثلاً آپ علامہ اقبال کے اس شعر پر غور کیجئے۔

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؓ ابتدا ہے اسمٰعیلؑ

غور طلب بات یہ ہے کہ شہادت حسینؓ اور ذبح اسمٰعیلؑ میں کون سی چیز مشترک ہے! حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے کے لئے آمادہ کون ہوئے؟ اللہ کے ایک جلیل القدر پیغمبر! کیا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت بھی کسی ایسے ہی ایک جلیل القدر شخص کے ہاتھوں ہوئی ہے؟ معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ۔ کون سی قدر مشترک ہے؟ حضرت اسمٰعیلؑ نے تو ذبح ہونے کے لئے خود ہی اپنی گردن پیش کی تھی' از روئے آیتِ قرآنی: ﴿فَلَمَّآ اَسْلَمَا ......﴾ ''پس جب ان دونوں (باپ بیٹوں) نے سرِ تسلیم خم کر دیا''۔ باپ اور بیٹے دونوں نے فرماں برداری کا بے مثال اور تاریخ ساز مظاہرہ پیش کیا' لہٰذا اس آیت میں تثنیہ کا صیغہ اَسْلَمَا آیا ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے دادِ شجاعت دیتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا تھا۔ اور وہ ''فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ'' (سورۃ توبہ) ''تو وہ قتل کرتے بھی ہیں اور (کبھی) قتل ہو بھی جاتے ہیں'' کے مصداقِ کامل بنے تھے۔ تو وہ کون سی بات ہے جو اِن دونوں واقعات کے مابین کسی پہلو سے مشترک قدر قرار دی جاسکتی ہے؟ پھر وہاں تو ارادۂ ذبح تھا' لیکن ذبح بالفعل ہوا نہیں۔ یہاں حضرت حسین رضی اللہ عنہ بالفعل شہید کئے گئے ہیں۔ لہٰذا ان واقعات میں آپ کو کوئی قدر مشترک نہیں ملے گی۔ ہاں ایک واقعاتی اشتراک پیدا ہوسکتا ہے۔ علامہ اقبال مرحوم بقید حیات ہوتے تو ان کی خدمت میں عرض کرتا کہ اس شعر کے دوسرے مصرعے کو تبدیل کر کے یوں کر دیا جائے تو واقعاتی اقدار کا اشتراک پیدا ہو جائے گا کہ۔

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی ہیں عثمانؓ ابتدا ہابیل

حضرت ہابیل کا قتل ہوا ہے اور اس شان کے ساتھ ہوا ہے کہ بھائی قتل پر تُلا ہوا ہے' اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا ہے لیکن وہ اللہ کا بندہ اپنی مدافعت میں ہاتھ اٹھانے کے لئے تیار نہیں۔ انہوں نے اپنے بھائی قابیل سے کہا:

﴿لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَیَّ یَدَكَ لِتَقْتُلَنِیْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیْكَ لِاَقْتُلَكَ ج﴾ (المائدہ:۲۸)

''اگر تم مجھے قتل کرنے کے لئے اپنا ہاتھ اٹھاؤ گے تب بھی میں اپنا ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا تم کو قتل کرنے کے لئے۔''

اور ہابیل قتل ہوگئے۔ بھائی نے بھائی کو قتل کر دیا۔ یہ وہ واقعہ ہے جس کا کلام اللہ میں سورۃ المائدۃ میں بڑے اہتمام اور بڑی شان کے ساتھ ذکر ہوا ہے۔ یہی وہ واقعہ ہے جس پر ہمیں وہ آیت مبارکہ ملتی ہے کہ ''اسی لئے ہم نے یہ لکھ دیا ہے کہ جس شخص نے بھی کسی ایک انسانی جان کو ناحق اور بغیر سبب قتل کیا تو اس نے گویا پوری نوعِ انسانی کو قتل کر دیا اور جس نے ایک بھی جان بچائی' اس نے گویا پوری نوع انسانی کی جان بچائی''۔

﴿فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ط وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ط﴾ (المائدہ:۳۲)

یہ واقعہ حضرت ہابیل کا ہے۔ اس کی کامل مناسبت اور مشابہت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت میں ہے۔ ہاتھ اٹھانے کو تیار نہیں ہوئے۔ طاقت ہے' قوت ہے' سب کچھ ہے۔ حضرت طلحہ' حضرت زبیر بن العوام' حضرت علی رضی اللہ عنہ محاصرین کی سرکوبی کی اجازت طلب کر رہے ہیں۔ انصار آ رہے ہیں کہ ہمیں اجازت دیجئے' ہم دوسری مرتبہ اللہ کے انصار بننا چاہتے ہیں۔ پہلے ہم نے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جاں نثاری میں اللہ کے مددگار ہونے کا خطاب حاصل کیا' آج ہم خلیفۃ الرسول کی مدد کرنے کے خواستگار ہیں۔ ہمیں موقع دیجئے کہ ہمارے اس خطاب کی پھر تجدید ہو جائے۔ مختلف صوبوں

کے گورنروں کے جو پیغامات آ رہے تھے کہ ہمیں فوجیں لے کر آنے کی اجازت دیجئے۔ اس کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا' جو صبر وثبات کے کوہ ہمالیہ ثابت ہوئے' جواب یہی تھا کہ نہیں' میں اپنی مدافعت میں کسی کلمہ گو کا خون بہانے کی اجازت نہیں دوں گا۔ حضرت حسنؓ' حضرت حسینؓ' حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم دروازے پر پہرے دار تھے لیکن باغی پیچھے سے دیوار پھاند کر گئے اور اس ہستی کو شہید کر دیا جس کو ذوالنورین کا لقب حاصل تھا اور جس سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم راضی تھے اور جس کے حق میں دعا فرمایا کرتے تھے کہ "اے اللہ! میں عثمانؓ سے راضی ہوں' تُو بھی اس سے راضی رہیو۔" حضرت عبداللہ بن سلام جو اسلام قبول کرنے سے پہلے ایک جید یہودی عالم تھے' وہ آتے ہیں اور باغیوں کو مخاطب کرتے ہیں کہ لوگو! باز آ جاؤ' میں تورات کا عالم ہوں اور میں تمہیں بتاتا ہوں کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اللہ کے کسی نبی کو قتل کیا گیا ہو اور اس کے بعد کم سے کم ستر ہزار انسان قتل نہ ہوئے ہوں یا کبھی کسی نبی کے خلیفہ کو قتل کیا گیا ہو اور اس کے بعد کم از کم پینتیس ہزار انسانوں کو قتل نہ کیا گیا ہو۔ جان لیجئے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جو فتنے کی آگ بھڑکی' اس میں چوراسی ہزار مسلمان قتل ہوئے۔

حضرت علیؓ کے عہد خلافت کے پورے پونے پانچ برس باہم خانہ جنگی میں گزرے۔ جنگ جمل ہے اور جنگ صفین ہے۔ جنگ نہروان ہے۔ مسلمان کے ہاتھ میں مسلمان کا گریبان ہے اور مسلمان کی تلوار مسلمان ہی کا خون چاٹ رہی ہے۔ مسلمان کا نیزہ ہے جو مسلمان کے سینے کے پار ہو رہا ہے۔ اور کیسے کیسے لوگ! حضرت طلحہؓ شہید ہو رہے ہیں' حضرت زبیرؓ شہید ہو رہے ہیں' حضرت عمار بن یاسرؓ شہید ہو رہے ہیں۔ پھر یہ کہ حضرت علیؓ شہید ہو رہے ہیں۔ حضرت امیر معاویہؓ پر حملہ ہوا لیکن ان پر وار کاری نہ پڑا اور وہ بچ گئے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ پر حملہ ہوا' لیکن وہ اس روز کسی وجہ سے نماز فجر کے لئے نہ آئے تھے' اس لئے ان کے مغالطے میں ان کے قائم مقام شہید ہوئے۔ پھر نہ جانے ان کے علاوہ کیسے کیسے مخلص اور شجاع مسلمان ان جنگوں میں کھیت رہے۔

اس بات کو ذہن میں رکھئے کہ اس سارے فتنے کی آگ بھڑکانے والے عبداللہ بن سبا کے حواری تھے اور یہ وہ آگ تھی جو پھر ٹھنڈی نہ ہو سکی۔ اس سبائی سازش کو سمجھنے کے لئے مَیں جنگ جمل کا ایک چھوٹا سا واقعہ پیش کرتا ہوں جو تمام مستند تاریخوں میں موجود ہے۔ یہ کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فوج کے ساتھ نکلی ہیں اور بصرہ پر ان کا قبضہ ہوا۔ حضرت عائشہؓ خلافت کی مدعی نہیں تھی' معاذ اللہ۔ ان کا مطالبہ صرف یہ تھا کہ خونِ عثمانؓ کا قصاص لیا جائے۔ اس وقت دونوں لشکر آمنے سامنے تھے اور حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ جنگ کے بجائے گفت وشنید سے قضیہ نمٹانے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ حضرت علیؓ کی طرف سے یہ بات سامنے آئی کہ وہ خونِ عثمانؓ کا قصاص لینے کے لئے بالکل تیار ہیں' لیکن پہلے ان کے ہاتھ تو مضبوط کئے جائیں۔ اگر ان کے ہاتھ پر بیعت ہو جائے اور انہیں تقویت پہنچائی جائے تو وہ فتنہ پردازوں سے پورا پورا حساب لیں گے۔ لہٰذا بات چیت شروع ہوئی۔ ایک بڑی امید افزا فضا نظر آنے لگی کہ حالات درست ہو جائیں گے۔ لیکن عین اس وقت عبداللہ بن سبا اور مالک بن اشتر نخعی رات کی تاریکی میں سازش کرتے ہیں کہ اس طرح تو ہمارا بھانڈا پھوٹے گا' ہماری سازش کا پردہ چاک ہو گا' یہ جو ڈرامہ کھیلنے کے لئے ہم نے سٹیج بچھائی ہے' یہ تو برباد ہو جائے گی۔ لہٰذا وہ رات کی تاریکی میں کچھ لوگوں کو لے کر حضرت عائشہؓ کے کیمپ پر حملہ کر دیتے ہیں۔ اِدھر یہ سمجھا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ کی فوجوں نے حملہ کر دیا ہے۔ اُدھر وہ حضرت علیؓ کے کیمپ میں یہ پیغام بھیجتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کے لشکر نے حملہ کی ابتدا کی ہے اور وہ اچانک ہم پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ چنانچہ دونوں لشکر ایک دوسرے سے پوری طرح بھڑ گئے۔ آپ اس بات کو پیشِ نظر رکھئے کہ جب جنگ چھڑ جاتی ہے تو تحقیق کا کوئی وقت نہیں ہوتا اور یہ قطعاً ممکن نہیں ہوتا کہ عین اس وقت تفتیش ہو کہ اصل معاملہ کیا ہے! کس نے ابتدا کی تھی اور اس کا اصل محرک کیا ہے؟ یہ تو وہ وقت ہوتا ہے کہ لوگ اپنی جان ہتھیلیوں پر رکھے برسرِ پیکار ہوتے ہیں۔ پھر جو خون ریزی ہوئی ہے اور سَو' دو سَو نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں مسلمان ایک دوسرے کی تلوار سے شہید ہوئے ہیں' یہ ہماری تاریخ کا ایک دردناک باب ہے۔ اس سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ واقعتاً فتنے کی آگ کو بھڑکانے والا چھوٹا سا گروہ بھی ہو سکتا

ہے کہ جو اس کو اس طرح بھڑکا دے کہ پھر اسے بجھایا نہ جا سکے۔ یہی معاملہ جنگِ صفین کے موقع پر ہوا ہے۔ وہاں بھی مصالحانہ گفتگو کی فضا پیدا ہو گئی تھی' لیکن سبائی سازشی گروہ نے اسے بھی ناکام بنا دیا اور فتنہ ختم نہیں ہوا بلکہ اس میں ''خوارج'' کے گروہ کا اضافہ ہو گیا اور ایک نیا محاذ کھل گیا۔

آگے چلئے! وقت کی قلت کی وجہ سے مجھے جو کچھ عرض کرنا ہے' اختصار کے ساتھ کرنا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ایک خارجی کے ہاتھوں شہادت ہوتی ہے۔ اس موقع پر یہ بات بھی ذہن میں رکھئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں عالمِ اسلام ایک وحدت کی صورت میں باقی نہیں رہا تھا۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ شام کے گورنر کی حیثیت سے اس بات کے مدعی تھے کہ خونِ عثمانؓ کا قصاص لیا جانا چاہئے۔ یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ حضرت معاویہؓ نے قطعاً خلافت کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ وہ ہرگز مدعی خلافت نہ تھے' نہ حضرت علیؓ کی خلافت کے منکر۔ وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلافت کے حق دار نہیں' معاذ اللہ۔ اور یہ کہ ان کے بدلے مجھے خلافت ملنی چاہئے' ہرگز نہیں۔ وہ صرف خونِ عثمانؓ کے قصاص کے مدعی تھے۔ ان کی ایک وسیع رقبے پر بحیثیت گورنر حکومت رہی ہے اور انہوں نے مطالبہ کیا کہ قاتلانِ عثمانؓ کو جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کیمپ میں شامل اور معاملات میں پیش پیش تھے' سزا دی جائے۔ اس کے بعد وہ بیعت کر لیں گے۔ ان کا موقف صحیح تھا یا غلط' اس پر گفتگو کا یہ موقع و محل نہیں ہے۔ فی الوقت پیشِ نظر صرف اس صورتِ واقعی کا بیان ہے کہ اس وقت عالمِ اسلام ایک وحدت کی حیثیت سے موجود نہیں تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد کوفہ میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت ہوئی۔ اب معلوم ہوا کہ نئے سرے سے تصادم کی نوبت آنے والی ہے۔ اِدھر حضرت حسنؓ کوفے سے چالیس ہزار فوج لے کر چلتے ہیں' اُدھر حضرت معاویہؓ دمشق سے ایک بڑی فوج لے کر روانہ ہوتے ہیں۔ مدائن کے آس پاس دونوں لشکروں کی مڈبھیڑ ہوتی ہے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی فوج کا ہراول دستہ آگے آگے جا رہا تھا۔ اس کے متعلق یہ افواہ اڑ گئی کہ اس کو شکست ہو گئی۔ یہ افواہ کس نے اڑائی...... واللہ اعلم۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہی کوفی جو حضرت حسنؓ کے ساتھ تھے' انہوں نے وہاں وہ طوفان بدتمیزی برپا کیا کہ بیان سے باہر ہے۔ بغاوت کر دی' خیمے لوٹ لئے' جناب حسن رضی اللہ عنہ پر دست درازی کی' آنجناب کے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ ان باغی کوفیوں کے ہاتھوں اپنی جان کا خطرہ دیکھ کر آنجناب کو کسریٰ کے محل میں پناہ لینی پڑی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو ان کوفیوں کے مزاج کا بخوبی تجربہ ہو گیا۔ چنانچہ انہوں نے مصالح دین کی خاطر وہیں سے حضرت معاویہؓ کو مصالحت کی پیش کش ارسال کر دی جسے حضرت معاویہؓ نے فوراً قبول کر لیا اور اپنی طرف سے ایک سادہ سفید کاغذ پر اپنی مہر لگا کر حضرت حسنؓ کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیج دیا کہ جو شرطیں آپ چاہیں لکھ دیں' مجھے منظور ہوں گی۔ اس کو ہم Blank Cheque سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ چنانچہ مصالحت ہو گئی۔ مصالحت نامہ میں ایک شرط یہ تھی کہ ایران کے صوبے اہواز کا خراج حضرت حسنؓ کو ملے گا۔ یہ ایران کا وہی صوبہ ہے جس کا آج کل اخبارات میں ایران و عراق کی جنگ کے سلسلے میں کافی ذکر ہو رہا ہے اور جہاں عرب کافی تعداد میں آباد ہیں۔ ایک دوسری شرط یہ تھی کہ بیس لاکھ درہم سالانہ میرے چھوٹے بھائی حضرت حسینؓ کو ملیں گے۔ ایک اور شرط یہ بھی تھی کہ وظائف کی تقسیم کے معاملے میں بنی ہاشم کے حق کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ تسلیم کیا جائے گا۔ ایک شرط یہ بھی تھی کہ اب تک جو کچھ ہوا ہے' اس پر کسی سے باز پرس نہیں ہو گی۔ گویا کہ یہ عام معافی (General Amnesty) کا اعلان تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے تمام شرائط منظور کر لیں اور الحمد للہ تقریباً پانچ سال کے اختلاف' افتراق' انتشار اور باہمی خانہ جنگی کا دروازہ بند ہوا۔ اب پورا عالمِ اسلام ایک وحدت بن گیا۔ واضح رہے کہ اس کے بعد حضرت معاویہؓ نے بیعتِ خلافت لی۔ اس صلح کے واقعہ پر حضرت حسنؓ نے ان الفاظ میں تبصرہ فرمایا کہ ''اگر خلافت ان کا یعنی حضرت معاویہؓ کا حق تھی تو ان تک پہنچ گئی اور اگر میرا حق تھی تو میں نے بھی ان کو سونپ دی۔ جھگڑا ختم ہوا۔'' یہ وہ بات تھی جس کی پیشین گوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی کہ میرے اس بیٹے یعنی حضرت حسنؓ کے ذریعے اللہ تعالیٰ ایک وقت میں مسلمانوں کے دو گروہوں میں مصالحت کرائے گا۔ یہ خصوصی مقام اور رتبہ ہے جناب حسن رضی اللہ عنہ کا...... ع

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا!

لیکن ذہن میں رکھئے' کہ وہ سازشی سبائی اس صورتِ حال سے سخت مشتعل تھے۔ انہوں نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ پر طعن کیا' آپ کی طرح طرح سے توہین کی' آپ کو'' یَا عارَ الْمُؤْمِنِیْنَ'' یعنی ''اے اہل ایمان کے حق میں عار اور ننگ اور شرم کے باعث انسان'' اور یَا مُذِلَّ الْمُؤْمِنِیْنَ یعنی ''اے مسلمانوں کو ذلیل کرنے والے انسان'' کہا گیا۔ یہ توہین آمیز خطابات وہ لوگ آپ کو دیتے تھے جو بظاہر آپ کے حامی تھے۔ وہ برملا کہتے تھے کہ اے حسنؓ تم نے یہ صلح کر کے ہماری ناک کٹوا دی ہے اور ''اہلِ ایمان'' کے لئے تم نے کوئی عزت کا مقام باقی نہیں رکھا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اس اُمت کی طرف سے ابد الآباد تک حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو جزاءِ خیر عطا فرمائے کہ ان کے اس ایثار کی بدولت وہ رخنہ بند ہو گیا اور وہ دراڑ پُر ہو گئی جو عالمِ اسلام میں اس آپس کے خلفشار کی وجہ سے پڑ گئی تھی۔

اب اس بات کو ذہن میں رکھئے کہ پورے بیس برس تک عالمِ اسلام پھر متحد رہا۔ یہ بات مَیں اس سے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہدِ حکومت کو اہلِ سنت دورِ خلافت راشدہ میں شامل نہیں کرتے۔ اسلامی حکومت کا آئیڈیل مزاج وہ ہے جو ہمیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے لے کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دس سال تک نظر آتا ہے۔ حضرت معاویہؓ صحابی اور کاتب وحی ہیں۔ کسی بدنیتی کو ہم ان کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے اور صحیح ہے کہ ان کا وہ مقام اور مرتبہ کبھی کسی نے نہیں سمجھا جو حضرت علیؓ کا ہے۔ میں نے پہلے بھی کئی بار عرض کیا ہے اور اس کا آج پھر اعادہ کرتا ہوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں جو جھگڑے رہے اور مسلمانوں میں آپس میں جو جنگیں ہوئیں' حاشا وکلّا ان کا کوئی الزام حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات پر نہیں ہے۔ اس میں ان کا نہ کوئی قصور تھا نہ کوتاہی...... معاذ اللہ۔ یہ تو اغیار کی سازش تھی کہ انہوں نے فتنہ کی آگ کو اس طرح بھڑکایا تھا کہ اس کو بجھایا نہ جا سکا۔ لیکن حضرت معاویہؓ کے عہد خلافت کے یہ بیس سال امن کے سال ہیں۔ باہمی خانہ جنگی ختم ہو گئی۔ ع ''ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا'' کی کیفیت پیدا ہوئی اور دعوت وتبلیغ اور جہاد وقتال کے عمل کا احیاء ہوا۔ توسیع از سرِ نو شروع ہوئی۔ فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا۔ یہ بیس سالہ دَور خلافتِ راشدہ کے بعد اُمت کی تاریخ میں جتنے بھی ادوار آئے ہیں' ان میں سب سے افضل اور بہتر دور ہے۔ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ سربراہِ حکومت ایک صحابی ہیں۔ ان کے بعد معاملہ آتا ہے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا لیکن وہ صحابی نہیں ہیں' تابعی ہیں۔ ع ''گر حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی''۔ ہم کسی غیر صحابی کو صحابی کے ہم پلہ اور ہم مرتبہ سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اہلِ سنّت کا مجمع علیہ عقیدہ ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی بھی اُمت کے بڑے سے بڑے ولی سے افضل ہے۔

چنانچہ یہی بات ایک دوسرے انداز میں حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہی تھی۔ ان سے دریافت کیا گیا کہ عمر بن عبدالعزیزؒ افضل ہیں یا امیر معاویہؓ ' انہوں نے جواب دیا کہ ''معاویہؓ سے عمر بن عبدالعزیزؒ کے افضل ہونے کا سوال کیا پیدا ہو گا۔ عمر بن عبدالعزیزؒ سے تو وہ خاک بھی افضل ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم رکابی میں اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے حضرت معاویہؓ کے گھوڑے کے نتھنوں میں گئی ہے''۔ یہ فرق ہے صحابیت اور غیر صحابیت میں۔ بہرحال میں نے عرض کیا کہ امیر معاویہؓ کے دورِ حکومت کے بیس سال میں امن رہا۔ واضح رہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی وہی ہیں' حضرت حسن رضی اللہ عنہ بھی دس سال تک زندہ رہے۔ سن ۴۱ھ میں یہ صلح ہوئی تھی اور سن ۵۱ھ میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا ہے۔ ان کا انتقال زہر کے اثر سے ہوا۔ زہر کس نے دیا' کیوں دیا؟ اس کا تعلق حضرت معاویہؓ سے ہونا بعید از قیاس ہے۔ ان کو کیوں ضرورت پیش آئی تھی کہ وہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو زہر دلواتے جبکہ صلح کے بعد ان دونوں کے قریبی اور دوستانہ مراسم تھے۔ زہر دینے والا کوئی سمجھ میں آ سکتا ہے تو وہ وہی گروہ ہو سکتا ہے کہ جس نے آنجناب کو ''عارَ الْمُؤْمِنِیْنَ'' اور ''مُذِلَّ الْمُؤْمِنِیْنَ'' جیسے اہانت آمیز خطابات دیئے تھے اور آپ کو طرح طرح سے ذہنی اذیتیں پہنچائی تھیں۔ ظاہر ہے کہ زہر دلایا ہو گا تو اسی گروہ نے دلوایا ہو گا۔ جن سے ان کی مصالحت ہے' ان کی طرف سے زہر دلانے کا امکان بہرحال عقلِ انسانی تسلیم نہیں کر سکتی۔

اس کے بعد آتا ہے امیر یزید کی بحیثیت ولی عہد نامزدگی اور پھر ان کے دورِ حکومت میں سانحۂ کربلا کا واقعہ جو دردناک بھی ہے اور افسوس ناک

بھی اور جس نے بلا شک وشبہ تاریخ اسلام پر بہت ہی ناخوشگوار اثرات چھوڑے ہیں۔ اس مسئلہ پر گفتگو سے قبل مَیں چاہتا ہوں کہ آپ سے عرض کروں کہ اس موقع پر یہ بات ذہن میں رکھ لیجئے کہ اگرچہ اُمت میں اختلاف اور افتراق کے افسانے بہت ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہمارے باقی اختلافات فقہی اختلافات ہیں' عقائد کے اختلافات نہیں ہیں —— عقائد کے اختلافات تو ہمارے ہاں کے کچھ نچلی سطح کے نام نہاد واعظین اور مولویوں نے بنالئے ہیں کہ جن کی دوکان چلتی ہی ان اختلافات کے بل پر ہے —— ورنہ ذہن میں رکھئے کہ دیوبندی ہوں' بریلوی ہوں ان کے عقائد ایک ہیں' عقائد کی مستند کتب ان کے ہاں ایک ہیں' ان کی فقہ بھی ایک ہے۔ پھر اہل سنّت کے جو دوسرے گروہ ہیں' وہ مالکی ہوں' شافعی ہوں' حنبلی ہوں' اہلحدیث ہوں' ان میں فقہی معاملات میں اختلافات ہیں' عقائد ایک ہی ہیں۔ ہاں عقائد میں جو اختلاف اور فرق واقع ہوا ہے تو وہ شیعوں اور سنیوں کے مابین ہوا ہے۔ اس اختلاف کو واقعتاً نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ تاریخی واقعات کے بارے میں رائے اور سیاسی اختلافات کو ایک طرف رکھا جاسکتا ہے۔ شخصیات کے بارے میں بھی اگر اختلاف ہو تو اسے بھی کسی حد تک نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ کسی کا ذاتی رجحان اگر یہ ہو کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے افضل سمجھتا ہے تو یہ بھی ایسی بنیادی واساسی بات نہیں ہے کہ جس کی بنا پر ''من دیگرم تو دیگری'' کا معاملہ ہو سکے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ پوری اُمت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو افضل ترین شخصیت ہی نہیں سمجھتی بلکہ پوری نوعِ انسانی میں انبیاء کرام کے بعد افضل البشر سمجھتی ہے۔ لیکن اسے بھی عقیدے کا بنیادی اختلاف قرار نہیں دیا جاسکتا۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ یہ لکھتے ہیں کہ:

> ''اگر میری طبیعت کو اس کی آزادی پر چھوڑ دیا جائے تو وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت کی قائل ہوتی نظر آتی ہے۔ لیکن مجھے حکم ہوا ہے کہ میں حضرت ابوبکر صدیق' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت کا اقرار کروں۔''

میری ناقص رائے میں خلفائے راشدین کی فضیلت میں تقدیم وتاخیر اگرچہ فی نفسہٖ ایک اہم مسئلہ ہے تاہم اسے عقیدے کا اختلاف قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اصل اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے نزدیک معصومیت ختم ہو چکی ہے جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ ہمارے نزدیک آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین والمرسلین کے ساتھ ساتھ خاتم المعصومین بھی ہیں اور ہم اسے ایمان بالنبوت اور ایمان بالرسالت کا ایک لازمی جزو سمجھتے ہیں' اور یہ بات یقیناً بنیادی عقیدے سے متعلق ہے۔ اس لئے کہ یہ عقیدہ ختم نبوت کا لازمی نتیجہ ہے۔ چونکہ عصمت ومعصومیت خاصۂ نبوت ہے' نبوت ختم ہوئی تو عصمت ومعصومیت بھی ختم ہوئی۔ اب نبوت کے بعد اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے۔ وحیٔ نبوت کا دروازہ بند ہے اور تا قیامِ قیامت بند رہے گا۔ تاریخِ انسانی کا بقیہ سارا دور اجتہاد کا ہے۔ اجتہاد میں مجتہد اپنی امکانی حد تک کوشش کرتا ہے کہ اس کی رائے قرآن وسنّت ہی سے ماخوذ ومستنبط ہو لیکن وہ معصوم عن الخطا نہیں ہے۔ اس اجتہاد میں خطاء بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر نیک نیتی کے ساتھ خطا ہے تو ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ مجتہد مخطی کو بھی اجر وثواب ملے گا' اگرچہ اکہرا۔ اور مجتہد اگر مصیب ہو یعنی صحیح رائے تک پہنچ گیا ہو تو اسے دوہرا اجر ملے گا —— جبکہ شیعہ مکتب فکر کا عقیدہ امامتِ معصومہ کا ہے۔ ہمارے نزدیک جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا' معصومیت خاصۂ نبوت ہے۔ وہ اپنے ائمہ کو بھی معصوم مانتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان سے خطاء کا صدور ممکن نہیں۔ ہمارے اعتبار سے تو اس نوع کی امامت ایک قسم کی نبوت بن جاتی ہے اور ہر قسم کی نبوت کو ہم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم سمجھتے ہیں۔ لہٰذا نبوت کے بعد جو بھی زمانہ آیا' اس میں کسی کا جو بھی اقدام ہے اس میں ہم احتمالِ خطاء کو بعید از امکان نہیں سمجھتے خواہ وہ اقدام حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہو خواہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ یا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا۔ لہٰذا اگر کوئی شخص ان میں سے کسی کے کسی فیصلہ یا اقدام کے بارے میں یہ رائے دینا چاہے کہ فلاں معاملے میں ان سے خطاء ہوئی تو اسے حق ہے' وہ کہہ سکتا ہے۔ البتہ دلیل سے بات کرے اور اسے اجتہادی خطاء سمجھے تو یہ بات ہمارے عقیدے سے نہیں ٹکرائے گی۔ یہ دوسری بات ہے کہ پوری چودہ سو سال کی تاریخ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور سے لے کر آج تک کسی شخص نے صدیق اکبرؓ کی کسی خطاء کو پکڑا نہیں ہے۔ لیکن اس کے

باوجود ہم یہ کہتے ہیں کہ امکانِ خطاء موجود تھا اور وہ معصوم عن الخطاء نہیں تھے۔ لہٰذا کوئی شخص اگر یہ کہنا چاہے کہ ان سے خطاء ہوئی' یہ نہ کرتے یا یوں کرتے تو بہتر تھا تو ہم اس کی زبان نہیں پکڑیں گے' چونکہ ہم ان کی معصومیت کے قائل ہی نہیں ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تو خود اپنی بعض اجتہادی آراء میں خطاء کا احساس ہوا' جن سے انہوں نے علی الاعلان رجوع کر لیا۔ البتہ اپنی ایک خطاء کا وہ صرف اعتراف کر سکے' اس کا ازالہ نہ ہو سکا۔ وہ یہ کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں خود انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر زور دے کر وظائف کے تعین کے معاملے میں ایک فرق رکھوایا' یعنی یہ کہ بدری صحابہ کو دوسروں کے مقابلے میں کافی زیادہ وظیفہ ملنا چاہئے اور اصحابِ شجرہ کو بدری صحابہؓ سے کم لیکن دوسروں سے زیادہ وظیفہ ملنا چاہئے۔ یہ فرقِ مراتب حضرت عمرؓ نے رکھوایا اور اپنی حیاتِ دُنیوی کے آخری ایام میں آپ اس پر پچھتائے۔ اس کی وجہ کیا تھی' وہ بھی جان لیجئے یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مسلمانوں کے جوشِ جہاد اور شوقِ شہادت کی وجہ سے نہایت عظیم الشان فتوحات ہوتی چلی گئیں اور مالِ غنیمت بے حد وحساب دارالاسلام میں آنے لگا۔ اب جو بڑے بڑے وظائف باقاعدگی سے ملے تو اس نے سرمایہ داری کی شکل اختیار کر لی' اس لئے کہ معاشرے میں بالفعل یہ صورت حال پیدا ہو گئی تھی کہ صدقہ خیرات لینے والا کوئی مستحق ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا تھا۔ بنابریں ارتکازِ دولت کی شکل پیدا ہونی شروع ہو گئی اور وظائف میں فرق وتفاوت نے اصحابِ دولت وثروت کے مابین بھی عظیم فرق وتفاوت پیدا کر دیا۔ اگر وہ دولت کسی ہموار ومساوی طریقے پر منتقل ہوتی تو یہ صورت حال رونما نہ ہوتی۔ یہ وہ چیز تھی جس کو دیکھ کر حضرت عمر فاروقؓ نے کہا تھا کہ:

"لو استقبلت ما استدبرت لاخذت فضول اموال الاغنیاء ولقسمته بین الناس" ......**او کما قال**

''اب اگر کہیں وہ صورت حال دوبارہ پیدا ہو جائے جو اب پیچھے جا چکی ہے تو میں لوگوں کے اموال میں جو فاضل ہے' وہ لے کر دوسرے لوگوں میں تقسیم کر دیتا۔''

پس معلوم ہوا کہ آنجناب کو ایک احساس ہوا۔ یہ بات میں نے صرف اس لئے عرض کی ہے کہ اہل سنّت کا یہ موقف واضح ہو جائے کہ خطاء کا احتمال و امکان ہر صحابی کے بارے میں ہو سکتا ہے' لیکن ہم اس خطاء کو اجتہادی خطاء قرار دیں گے اور اسے نیک نیتی پر محمول کریں گے۔ یہ بات ہر صحابی کے بارے میں کہی جائے گی۔ یہی بات اور یہی رائے نہ صرف حضرت امیر معاویہ' حضرت عمرو بن العاص' حضرت مغیرہ بن شعبہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے بارے میں کہی جا سکتی ہے بلکہ حضرت علی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی۔ یہاں تک کہ حضراتِ شیخین اور حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

لہٰذا یہ بات پیش نظر رکھئے کہ اب گفتگو کا جو مرحلہ آ رہا ہے جو حضرت امیر معاویہؓ کے ایک اہم اقدام سے متعلق ہے' اس کے بارے میں بھی دو رائیں ممکن ہیں۔ ان کو یہ بات حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے سوجھائی (جو مسلمہ طور پر ایک نہایت ذہین وفہیم' مدبر اور دُور رَس نگاہ رکھنے والے صحابی مانے جاتے ہیں) کہ ''دیکھئے مسلمانوں میں آپس میں جو کشت وخون ہوا اور پانچ برس کا جو عرصہ آپس کی لڑائی جھگڑے میں گزرا' کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کے بعد پھر وہی حالات پیدا ہو جائیں۔ لہٰذا اپنی جانشینی کا مسئلہ اپنی زندگی ہی میں طے کر کے جائیے''۔ اب کوئی شخص چاہے (اور ہمارے ہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے) تو وہ بڑی آسانی سے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ پر یہ فتویٰ لگا دے کہ انہوں نے کسی لالچ اور کسی انعام کی امید کی وجہ سے یا چاپلوسی کے خیال سے یہ رائے دی۔ معاذ اللہ! ہم یہ رائے نہیں دے سکتے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ ان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں شامل ہیں جنہوں نے حدیبیہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر وہ بیعت کی تھی جس کو بیعت رضوان کہا جاتا ہے' اور اس بیعت پر سورۂ فتح میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا کا اظہار فرمایا ہے۔ چنانچہ وہ اصحابِ شجرہ میں سے ہیں۔ پھر حضرت علیؓ کے پورے عہد حکومت میں وہ حضرت علیؓ کے بڑے حامیوں (Supporters) میں رہے اور ہر مرحلے میں انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا۔ لیکن وہ اُمت کے حالات کو دیکھ رہے تھے۔ آپس کی خانہ جنگی کا انہیں تلخ اور دردناک تجربہ ہوا تھا۔

وہ جو انگریزی کی مثل ہے کہ ''بہت سا پانی دریا میں بہہ گیا ہے'' اس کے مصداق حالات میں بہت کچھ تبدیلی آ چکی ہے۔ یہ ۶۰ ہجری کے لگ بھگ کا زمانہ ہے۔ آنحضور ﷺ کی وفات پر پورے پچاس برس گزر چکے ہیں۔ کبار صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی عظیم اکثریت اللہ کو پیاری ہو چکی ہے۔ اب تو صغارِ صحابہ میں بھی کچھ ہی لوگ موجود ہیں اور یہ گویا صحابہ کی دوسری نسل کے افراد ہیں—— جیسے حضرت زبیر بن العوام ؓ شہید ہو چکے' اب ان کے بیٹے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ ہیں۔ حضرت عمرؓ شہید ہو چکے' اب ان کے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہیں۔ حضرت عباسؓ اللہ کو پیارے ہو چکے البتہ ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عباسؓ موجود ہیں۔ اسی طرح حضرت ابوبکر ؓ کے صاحبزادے حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ ہیں۔ الغرض چند صغارِ صحابہؓ کو چھوڑ کر تقریباً ننانوے فی صد لوگ تو بعد کے ہیں۔ پھر وہ جوش و جذبۂ ایمانی بھی پچاس سال کے بعد اس درجے کا نہ رہا تھا جو خلافتِ راشدہ کے ابتدائی پچیس سال تک نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں ''جوہر اندیشہ'' اور شدتِ احساس کا عالم تو یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے دور میں ایک موقع پر جب کچھ عیسائی آئے اور ان کو قرآن مجید کی آیات سنائی گئیں اور شدتِ تاثر سے ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تو خود حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا:

"ھکذا کنا حتی قَسَتِ القلوب"

''یہی حال کبھی ہمارا ہوا کرتا تھا کہ قرآن مجید پڑھتے تھے اور سنتے تھے تو ہماری آنکھوں سے آنسو جاری ہو جایا کرتے تھے' یہاں تک کہ دل سخت ہو گئے۔''

ذرا غور فرمائیے' یہ بات حضرت ابوبکر ؓ اپنے متعلق فرما رہے ہیں کہ ہمارے دل سخت ہو گئے۔ اسی طرح انتقال کے وقت حضرت عمر ؓ اپنے بارے میں فرماتے ہیں کہ ''مَیں اگر برابر برابر پر چھوٹ جاؤں تو بہت بڑی کامیابی سمجھوں گا''۔ پھر یہی حضرت عمر فاروق ؓ ہیں جو حضرت حذیفہؓ سے پوچھتے تھے کہ: ''میں قسم دے کر تم سے پوچھتا ہوں' کہیں میرا نام ان منافقوں کی فہرست میں تو نہیں تھا جن کے نام نبی اکرم ﷺ نے تمہیں بتائے تھے؟'' تو ان جلیل القدر صحابہ کے شدتِ احساس کی اگر یہ صورت تھی تو آپ سوچئے کہ ع ''تا بہ دیگراں چہ رسد!'' لہٰذا ان حالات میں حضرت مغیرہ ؓ کی سمجھ میں مصالح امت کا یہی تقاضا آیا کہ امیر معاویہ ؓ اپنا کوئی جانشین نامزد فرما دیں' چونکہ اس وقت فی الواقع بحیثیت مجموعی امت کے حالات اس جمہوری اور شورائی مزاج (Republican Character) کے متحمل نہیں رہے ہیں جو محمد رسول اللہ ﷺ نے پیدا فرمایا تھا۔ لہٰذا حالات کے پیش نظر ایک سیڑھی نیچے اتر کر فیصلہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ حضرت مغیرہ ؓ نے دلائل کے ساتھ حضرت معاویہؓ سے اصرار کیا کہ وہ اپنا جانشین نامزد کریں اور اس کی بیعتِ ولی عہدی لیں۔ پھر ان ہی نے جانشینی کے لئے یزید کا نام تجویز کیا۔ یہاں یہ بات اچھی طرح جان لینی چاہئے کہ جو شخص کسی بھی درجے میں حضرت مغیرہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو بدنیت قرار دے گا' اس کا معاملہ اہل سنّت سے جدا ہو جائے گا۔ اہل سنّت کا عقیدہ یہ ہے کہ ''**الصحابة کلھم عدول**''۔ بدنیتی کی نسبت ہم ان کی طرف نہیں کر سکتے' اختلاف کر سکتے ہیں۔ ہم انہیں معصوم نہیں مانتے۔ ان سے خطاء ہو سکتی ہے۔ ان کے کسی فیصلہ کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ یہ صحیح فیصلہ نہیں تھا۔ کوئی یہ کہے تو اس سے اس کے ایمان' عقیدہ اور اہل سنّت میں سے ہونے پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ یہ رائے دی جا سکتی ہے۔ لیکن جو شخص بدنیتی کو کسی صحابیٔ رسولؐ کی طرف منسوب کرتا ہے تو جان لیجئے کہ وہ خواہ اور کچھ بھی ہو بہرحال اہل سنّت والجماعت میں شمار نہیں ہو گا۔

اب تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے یعنی یہ کہ جن کی نیک نیتی ہر شبہ سے بالاتر ہے' انہوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ عمل اسلام کے مزاج کے ساتھ مناسبت رکھنے والا نہیں ہے۔ ان میں پانچ نام بہت مشہور ہیں۔ تین تو اُمت کے مشہور ''عبادلہ'' میں سے ہیں یعنی حضرت عبداللہ بن زبیر' عبداللہ بن عمر اور عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ ایک حضرت حسین ابن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور ایک حضرت ابوبکر کے صاحبزادے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ تعالیٰ

عنہما۔ انہوں نے یزید کی بیعتِ ولی عہدی سے انکار کیا۔ اور ذہن میں رکھئے کہ یہ تاریخی جملہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کا ہے کہ جب مدینہ کے گورنر نے ولی عہدی کی بیعت لینی چاہی ہے تو انہوں نے بڑے غصے سے کہا کہ ''کیا اب تم رسول اللہؐ اور خلفائے راشدین کی سنّت کے بجائے قیصر و کسریٰ کی سنّت رائج کرنا چاہتے ہو کہ باپ کے بعد بیٹا جانشین ہو''۔

تیسری جانب یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ ان پانچ حضرات کو چھوڑ کر امت کی عظیم ترین اکثریت نے بیعت کر لی' جس میں کثیر تعداد میں صحابہ بھی شامل تھے۔ اب اس واقعہ کے بعد اگر کوئی چاہے تو ان سب کو بے ضمیر قرار دے۔ کسی کی زبان کو تو نہیں پکڑا جاسکتا۔ کہنے والے یہ بھی کہہ دیں گے کہ حضرت امیر معاویہؓ نے ان کے ایمان دولت کے ذریعے خرید لئے تھے۔ لیکن ذرا توقف کر کے غور فرمایئے کہ ع ''ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں'' کے مصداق سب سے پہلے اس زد میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی ذات گرامی آئے گی۔ گویا انہوں نے حضرت معاویہؓ کے حق میں دولت کے عوض دستبرداری قبول کر کے اپنی خلافت فروخت کی تھی۔ معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ...... لیکن ایسی بات کہنے والوں کو ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہئے کہ اس طرح ہدفِ ملامت و اہانت کون کون سی لائق صد احترام ہستیاں بنتی ہیں۔ ہم ان سب کو نیک نیت سمجھتے ہیں۔ جو بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس وقت موجود تھے' ان میں سے جنہوں نے ولی عہدی کی بیعت کی اور جنہوں نے انکار کیا وہ سب کے سب نیک نیت تھے۔ سب کے پیش نظر اُمت کی مصلحت تھی۔ حضرت حسنؓ نے جو ایثار فرمایا تھا وہ تو تا قیامِ قیامت اُمت پر ایک احسان عظیم شمار ہوگا۔ یہ بات بھی پیش نظر رکھئے کہ جو دوسرا مکتب فکر ہے وہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو بھی امامِ معصوم مانتا ہے لہٰذا ان کا طرزِ عمل خود ان کے اپنے عقیدے کے مطابق صد فی صد درست قرار پاتا ہے۔

اب آیئے! حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے موقف کو سمجھنے کی کوشش کریں! اہل سنّت اس معاملے میں یہ رائے رکھتے ہیں کہ پوری نیک نیتی سے آنجناب یہ سمجھتے تھے کہ اسلام کے شورائی اور جمہوری مزاج کو بدلا جارہا ہے۔ حالات کے رخ کو اگر ہم نے تبدیل نہ کیا تو وہ خالص اسلام جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے اور وہ کامل نظام جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا تھا' اس میں کجی کی بنیاد پڑ جائے گی' لہٰذا اسے ہر قیمت پر روکنا ضروری ہے۔ یہ رائے ان کی تھی اور پوری نیک نیتی سے تھی۔ پھر شہر کوفہ کے لوگ ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لئے برابر ان کو پیغامات بھیج رہے تھے اور کوفیوں کے خطوط سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پاس بوریاں بھر گئی تھیں۔ یہ بھی ذہن میں رکھئے کہ کوفہ صرف ایک شہر ہی نہیں تھا بلکہ سیاسی اور فوجی حیثیت سے اس کی بھی بڑی اہمیت تھی۔ لہٰذا آنجناب کی رائے تھی کہ اہالیانِ کوفہ کے تعاون سے وہ حالات کا رخ صحیح جانب موڑ سکتے ہیں۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ ایسے تمام معاملات اجتہادی ہوتے ہیں۔ اس رائے میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی شریک تھے کہ ولی عہدی کی جو رسم پڑ گئی ہے وہ اسلام کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی لیکن وہ آگے جا کر اختلاف کرتے ہیں۔ ان کا اختلاف کامیابی کے امکانات کے بارے میں تھا۔ وہ کوفہ والوں کو قطعی ناقابل اعتبار سمجھتے تھے۔ ظاہر بات ہے کہ کسی اقدام سے پہلے خوب اچھی طرح جائزہ لینا ہوتا ہے کہ اقدام کے لئے جو وسائل و ذرائع ضروری ہیں' وہ موجود ہیں یا نہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان پر قتال مکہ میں فرض نہیں ہوا تھا بلکہ مدینہ میں ہوا' جبکہ اتنی قوت بہم پہنچ گئی تھی کہ قتال سے اچھے نتائج کی توقع کی جاسکے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی مخلصانہ رائے تھی کہ کامیاب اقدام کے لئے جو اسباب درکار ہیں' وہ فی الوقت موجود نہیں ہیں۔ لہٰذا وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کوفہ والوں کی دعوت قبول کرنے اور وہاں جانے سے باصرار والحاح منع کرتے رہے۔ لیکن حضرت حسینؓ کی رائے یہ تھی کہ کوفہ والوں کی دعوت قبول کرنی چاہئے۔ اصل معاملہ یہ تھا کہ جو سچا انسان ہوتا ہے وہ اپنی سادگی اور شرافت میں دوسروں کو بھی سچا ہی سمجھتا ہے اور اپنی صداقت کی بنیاد پر دوسروں سے بھی حسنِ ظن رکھتا ہے۔ کوفہ کوئی معمولی شہر نہیں تھا' انتہائی Strategic مقام پر واقع تھا۔ یہ سب سے بڑی چھاؤنی تھی جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں قائم کی گئی تھی' اس لئے کہ یہ وہ مقام ہے جس سے اُس شاہراہ کا کنٹرول ہوتا ہے جو ایران اور شام کی طرف جاتی ہے۔ لہٰذا حضرت حسینؓ یہ رائے رکھتے تھے کہ اگر کوفہ کی عظیم اکثریت ان کا ساتھ دینے کے لئے آمادہ ہے' جیسا کہ ان کے خطوط سے ظاہر

ہوتا ہے تو اس کے ذریعے اسلامی نظام میں لائی جا رہی تبدیلی کا ازالہ کیا جا سکتا ہے اور اس کا راستہ روکا جا سکتا ہے۔ لیکن اس رائے سے اختلاف کر رہے ہیں حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین۔ یہ اختلاف بھی معاذ اللہ بدنیتی پر مبنی نہیں تھا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی اور یہ تینوں عبادلہ بھی نیک نیت تھے۔ ان تینوں حضرات نے لاکھ سمجھایا کہ آپ کوفہ والوں پر ہرگز اعتماد نہ کیجئے۔ یہ لوگ قطعی بھروسے کے لائق نہیں ہیں۔ یہ لوگ جو کچھ آپ کے والدِ بزرگوار کے ساتھ کرتے رہے ہیں، اس کو یاد کیجئے۔ جو کچھ آپ کے برادرِ محترم کے ساتھ کر چکے ہیں، اس کو پیشِ نظر رکھئے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ان کے دل آپ کے ساتھ ہوں، لیکن ان کی تلواریں آپ کی حمایت میں نہیں اٹھیں گی بلکہ معمولی خوف یا دباؤ یا لالچ سے آپ کے خلاف اٹھ جائیں گی۔ لیکن حضرتِ حسین رضی اللہ عنہ کا ایک فیصلہ ہے جس پر وہ کمالِ استقامت کے ساتھ عمل پیرا ہیں، اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس معاملہ میں فرمانِ خداوندی اور سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کر رہے ہیں یعنی ﴿فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ﴾ یعنی پہلے خوب غور کر لو، سوچ لو، امکانات کا جائزہ لے لو۔ تدبیر کو بروئے کار لانا ضروری ہے۔ ساز و سامان کی فراہمی ضروری ہے۔ یہ بھی دیکھو کہ جو صورتِ حال (Situation) فی الواقع درپیش ہے، اس کے تقاضے پورے کرنے کی اہلیت ہے یا نہیں۔ لیکن جب ان مراحل سے گزر کر ایک فیصلہ کر لو تو اللہ پر بھروسہ رکھتے ہوئے اقدام کرو۔ ''فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ'' یہ رہنمائی ہے قرآن و سنّت میں۔

آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے Assessment میں غلطی کی لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے کسی بدنیتی سے یا حکومت و اقتدار کی طلب میں یہ کام کیا۔ معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ۔ اہل سنّت کا یہ عقیدہ ہرگز نہیں ہے۔ میں ذاتی طور پر اس بات سے کھلم کھلا اور سرِعام اعلانِ براءت کرتا ہوں۔ اگر کسی کو یہ شک وشبہ یا غلط فہمی ہو کہ معاذ اللہ میری یہ رائے ہے کہ حضرتِ حسین رضی اللہ عنہ کے اس اقدام میں کوئی نفسانیت یا کوئی ذاتی غرض تھی تو میں اس سے بالکلیہ بری ہوں۔ الحمد للہ، ثم الحمد للہ۔ کسی کی یہ رائے اگر ہو تو ہو لیکن اچھی طرح جان لیجئے کہ اہل سنّت کے جو مجموعی اور مجمع علیہ عقائد ہیں ان میں یہ بات شامل ہے کہ حضرتِ حسینؓ کے اقدام اور مشاجراتِ صحابہؓ کے ضمن میں کسی صحابیٔ رسولؐ پر بدنیتی اور نفسانیت کا حکم لگانے سے ایمان میں خلل واقع ہوگا۔ بلاتخصیص ہم تمام صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو عدول مانتے ہیں، البتہ معصوم کسی کو نہیں مانتے اور ہر ایک سے خطاءِ اجتہادی کے احتمال و امکان کو تسلیم کرتے ہیں۔ حضرتِ حسین رضی اللہ عنہ کی نیک نیتی سے ایک رائے تھی، نیک نیتی ہی سے ایک اندازہ (Assessment) تھا اور جب اس پر انشراح ہو گیا تو دین ہی کے لئے عزیمت تھی۔

جب ولی عہدی کی بیعت کا مسئلہ مدینہ منورہ میں پیش ہوا تھا تو حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ وہاں سے مکہ مکرمہ چلے گئے تھے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے بھی ایسا ہی کیا۔ چند حضرات کی رائے یہ تھی کہ مکہ مکرمہ ہی کو Strong-Hold اور اصل Base بنایا جائے اور اس ولی عہدی کے خلاف رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے اپنی قوتوں کو مجتمع کیا جائے۔ ابھی اس سلسلہ میں کوئی مؤثر کام شروع نہیں ہو سکا تھا کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا اور بحیثیت ولی عہد حکومت امیر یزید کے ہاتھ میں آ گئی، جس کے بعد کوفہ والوں نے خطوط بھیج بھیج کر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو اپنی وفاداری اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کر کے جدوجہد اور اقدام کا یقین دلایا۔ آنجناب نے تحقیق حال کے لئے اپنے چچا زاد بھائی حضرت مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ کو کوفہ بھیجا۔ ان کی طرف سے بھی اطلاعات یہی موصول ہوئیں کہ اہل کوفہ بدل و جان ساتھ دینے کے لئے تیار ہیں۔ حضرت حسینؓ نے کوفہ کے سفر کا ارادہ کر لیا اور کوچ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ دونوں نے بہت سمجھایا کہ مکہ سے نہ نکلئے۔ یہ دونوں حضرات یہ کہتے ہوئے رو پڑے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جس طرح امیر المؤمنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ان کے گھر والوں کے سامنے ذبح کر دیا گیا اسی طرح آپ کے اہل و عیال کے سامنے آپ کو بھی ذبح کر دیا جائے۔ جب حضرتِ حسینؓ نے کوچ کیا ہے تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ ان کی سواری کے ساتھ دوڑتے ہوئے دور تک گئے ہیں اور اصرار کرتے رہے ہیں کہ خدا کے لئے باز آ جائیے اور اگر جانا ہی ہے تو خواتین اور بچوں کو تو ساتھ لے کر نہ جائیے۔ اور یہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کون

ہیں! رشتے میں ایک جانب سے حضرت حسینؓ کے چچا لگتے ہیں تو دوسری طرف نانا۔ اس لئے کہ والد یعنی حضرت علیؓ کے چچازاد بھائی ہیں اور نانا یعنی نبی اکرم ﷺ کے بھی چچازاد بھائی ہیں! لیکن اس وقت محبت سے مغلوب ہو کر کہہ رہے ہیں: اے ابن عم! خدا کے لئے باز آ جاؤ یا کم از کم ان عورتوں اور بچوں کو مکہ مکرمہ ہی میں چھوڑ جاؤ۔ لیکن نہیں' دوسری جانب عزیمت کا ایک کوہِ گراں ہے' پیکرِ شجاعت ہے' سراپا استقامت ہے۔ نیک نیتی سے جو فیصلہ کیا ہے' اس پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد راستے میں جب اطلاع ملی کہ حضرت مسلم بن عقیلؓ جو ایلچی اور تحقیق کنندہ کی حیثیت سے کوفہ گئے تھے' وہاں شہید کر دیئے گئے اور کوفہ والوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی —— سب کے سب نے گورنرِ کوفہ کے سامنے حکومتِ وقت کے ساتھ وفاداری کا عہد استوار کر لیا ہے —— تو حضرت حسینؓ نے سوچنا شروع کیا کہ سفر جاری رکھا جائے یا مکہ واپسی ہو۔

لیکن ذہن میں رکھئے کہ ہر قوم کا ایک مزاج ہوتا ہے جو انسان کی شخصیت کا جزو لاینفک ہوتا ہے۔ عرب کا مزاج یہ تھا کہ خون کا بدلہ لیا جائے خواہ اس میں خود اپنی جان سے بھی کیوں نہ ہاتھ دھو لینے پڑیں۔ چنانچہ حضرت مسلمؓ کے عزیز رشتہ دار کھڑے ہو گئے کہ اب ہم ان کے خون کا بدلہ لئے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔ حضرتِ حسین رضی اللہ عنہ کی شرافت اور مروّت کا تقاضا تھا کہ وہ ان لوگوں کا ساتھ نہ چھوڑیں جو ان کے مشن میں ان کا ساتھ دینے کے لئے نکلے تھے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ حضرت مسلم بن عقیلؓ کے خونِ ناحق کا بدلہ لینے کے عزم کا اظہار کرنے والوں کا ساتھ یہ پیکرِ شرافت و مروّت نہ دیتا! لہٰذا سفر جاری رہا۔ اسی دوران حضرت عبداللہ بن جعفر طیار رضی اللہ عنہ جو چچازاد بھائی ہیں' ان کے بیٹے حضرت عون اور حضرت محمد ان کا پیغام لے کر آئے ہیں کہ ''خدا کے لئے اُدھر مت جاؤ''۔ لیکن فیصلہ اٹل ہے۔ ان دونوں کو بھی ساتھ لیتے ہیں اور سفر جاری رہتا ہے حتیٰ کہ قافلہ دشتِ کربلا میں پہنچ گیا۔ اُدھر کوفہ سے گورنر ابن زیاد کا لشکر آ گیا۔ یہ لشکر ایک ہزار افراد پر مشتمل تھا اور اس کو صرف ایک حکم تھا کہ وہ حضرت حسینؓ کے سامنے یہ دو صورتیں پیش کرے کہ آپ نہ کوفہ کی طرف جا سکتے ہیں نہ مکہ مکرمہ یا مدینہ منورہ کی طرف مراجعت کر سکتے ہیں' ان دونوں سمتوں کے علاوہ جدھر آپ جانا چاہیں اس کی اجازت ہے۔

یہاں اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ یہ تیسرا راستہ کون سا ہو سکتا تھا! وہ راستہ تھا دِمشق کا۔ لیکن افسوس کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اسے اختیار نہ کیا بلکہ آپ وہیں ڈٹے رہے۔ اب عمرو بن سعد کی قیادت میں مزید چار ہزار کا لشکر کوفہ پہنچ گیا۔ اور یہ عمرو بن سعد کون تھے؟ افسوس کہ ان کے نام کو گالی بنا دیا گیا ہے۔ یہ تھے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فاتح ایران اور یکے از عشرہ مبشرہ کے بیٹے جن کی حضرتِ حسینؓ کے ساتھ قرابت داری بھی ہے۔ وہ بھی مصالحت کی انتہائی کوشش کرتے ہیں اور گفت و شنید جاری رہتی ہے۔ اب حضرت حسینؓ کی طرف سے تین صورتیں پیش ہوتی ہیں۔ یعنی یہ کہ: ''یا مجھے مکہ مکرمہ واپس جانے دو' یا مجھے اسلامی سرحدوں کی طرف جانے دو تاکہ میں کفار کے خلاف جہاد و قتال میں اپنی زندگی گزار دوں' یا میرا راستہ چھوڑ دو۔ میں دِمشق چلا جاؤں۔ میں یزید سے اپنا معاملہ خود طے کر لوں گا''۔ لیکن اب گھیرا تنگ ہو گیا ہے اور صورتِ حال یکسر بدل گئی ہے۔ یہ بھی خوب جان لیجئے کہ اس کی اصل وجہ کیا ہے!

حضرت حسینؓ نے میدانِ کربلا میں ابن زیاد کے بھیجے ہوئے لشکروں کے سامنے جو خطبات دیئے اس میں انہوں نے بھانڈا پھوڑ دیا کہ میرے پاس کوفیوں کے خطوط موجود ہیں جنہوں نے مجھے یہاں آنے کی دعوت دی تھی۔ انہوں نے اس کوفی فوج کے بہت سے سرداروں کے نام لے لے کر فرمایا ''اے فلاں ابن فلاں! یہ تمہارے خط ہیں کہ نہیں؟ جن میں تم نے مجھ سے بیعت کرنے کے لئے مجھے کوفہ آنے کی دعوت دی تھی۔'' اس پر وہ لوگ براءت کرنے لگے کہ نہیں ہم نے یہ خطوط نہیں بھیجے۔ اب ان کی جان پر بنی ہوئی تھی' کیونکہ مصالحت کی صورت میں حکومتِ وقت سے ان کی غداری کا جرم ثابت ہو جاتا۔ جنگِ جمل اور جنگِ صفین کے واقعات یاد کیجئے۔ جہاں بھی مصالحت کی بات ہو گی' وہاں وہی سبائی فتنہ آڑے آئے گا جو اس

سارے انتشار و افتراق اور خانہ جنگیوں کا بانی رہا ہے۔ مصالحت کی صورت میں تو ان کا کچا چٹھا کھل جاتا اور معلوم ہو جاتا کہ دوستی کے پردوں میں رہ کر کون دشمنی کرتا رہا ہے اور وہ کون ہیں جو سادہ لوح عوام کو دھوکا دے کر اور خواص کو بہلا پھسلا کر مسلمان کو مسلمان کے خلاف محاذ آرا کرتے رہے ہیں۔ حضرت حسینؓ کے پاس کوفیوں کے بوریوں بھرے خطوط تھے۔ مفاہمت کی صورت میں جب یہ سامنے آتے تو ان کا حشر کیا ہوتا' اس کو اچھی طرح آج بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان سرداروں اور ان کے حواریوں نے مصالحت و مفاہمت کا سلسلہ جاری رہنے نہیں دیا اور عمرو بن سعد کو مجبور کر دیا کہ وہ حضرت حسینؓ کے سامنے یہ شرط پیش کرے کہ یا تو غیر مشروط طور پر Surrender کیجئے' ورنہ جنگ کیجئے۔ یہ سازشی لوگ حضرتِ حسینؓ کے مزاج سے اتنے ضرور واقف تھے کہ ان کی غیرت وحمیت غیر مشروط طور پر حوالگی کے لئے تیار نہیں ہوگی اور فی الواقع ہوا بھی یہی۔
یہاں یہ جان لیجئے کہ معاملہ تھا حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما کا! اُن کی غیرت' اُن کی حمیت' اُن کی شجاعت اس توہین و تذلیل کو ہرگز گوارا نہ کرسکتی تھی۔ لہٰذا انہوں نے غیر مشروط Surrender کرنے سے انکار کر دیا اور مسلح تصادم ہو کر رہا' جس کے نتیجے میں سانحۂ کربلا واقع ہوا۔ دادِ شجاعت دیتے ہوئے آپ کے ساتھی شہید ہوئے۔ آپ کے اعزہ و اقارب نے اپنی جانیں نچھاور کیں اور آپ نے بھی تلوار چلاتے ہوئے اور دشمنوں کو قتل کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش فرمایا۔ اِنا للہ و انا اِلیہ راجعون۔

یہ ہے اصل حقیقت اس سانحۂ فاجعہ کی۔ اصل سازشی ذہن کو پہچانئے! جیسے حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے درمیان اختلاف کا افسانہ جس نے بھی تراشا ہے' بڑی عیارانہ مہارت سے تراشا اور گھڑا ہے۔ اس افسانے سے حقائق گم کر دیئے گئے ہیں۔ اب ہوتا یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ اصل مجرم کو Pin-Point کیا جائے' کوئی حضرت عثمان ؓ کو تنقید کا ہدف بناتا ہے تو کوئی حضرت علیؓ کو۔ اس طرح یہ دونوں فریق ان سازشی سبائیوں کے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ حضرت عثمانؓ کی شخصیت مجروح ہوتی ہے تو بھی ان کا کام بنتا ہے اور حضرت علیؓ کی ذاتِ گرامی مجروح ہوتی ہے تو بھی ان کے پو بارہ ہوتے ہیں۔ یہ حضرت عثمانؓ کون ہیں؟ یہ ہیں ذوالنورین' نبی اکرم ﷺ کے دوہرے داماد اور یکے از عشرہ مبشرہ۔ اور یہ حضرت علیؓ کون ہیں؟ آنحضور ﷺ کے تربیت یافتہ آپؐ کے چچازاد بھائی' آپؐ کے داماد' آپؐ کے محبوب اور یکے از عشرہ مبشرہ۔ ان دونوں میں سے کسی کی بھی شخصیت مجروح ہوتی ہے تو اس کی زد پڑتی ہے نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس پر' جو ان دونوں کے مزکی و مربی تھے۔ ان شخصیتوں میں اگر نقص اور عیب مانا جائے گا تو محمد رسول اللہ ﷺ کی تربیت پر حرف آئے گا اور آنحضرت ﷺ کی شخصیتِ مبارکہ مجروح ہوگی۔ افسوس کہ آج بھی اُن سبائیوں کا کام دونوں طرف سے بن رہا ہے۔

خوب جان لیجئے کہ ایسے تمام لوگ چاہے وہ اس کا شعور رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں' سبائی ایجنٹ ہیں۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ ''**الصحابۃ کلھم عدول**''۔ کوئی بدنیتی اور نفسانیت نہ حضرت عثمان میں تھی نہ حضرت علی میں' نہ حضرت معاویہ میں تھی نہ حضرت مغیرہ بن شعبہ میں' نہ حضرت عمرو بن العاص میں تھی نہ حضرت ابوموسیٰ اشعری میں' نہ حضرت حسین بن علی میں تھی نہ حضرت عبداللہ بن عباس یا عبداللہ بن عمر میں' رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ ہاں ایک فتنہ تھا جس نے ہر مرحلہ پر جب بھی مصالحت و مفاہمت کی صورت پیدا ہوتی نظر آئی' اس کو تارپیڈو کیا اور اس کے بجائے ایسی نازک صورتِ حال (Critical Situation) پیدا کر دی کہ کشت و خون ہو' مسلمان ایک دوسرے کی گردنوں پر تلواریں چلائیں' فتنہ اور بھڑکے' حق کے سیلاب کے آگے بند باندھا جا سکے اور ع ''رکتا نہ تھا کسی سے سیل رواں ہمارا'' والی صورت ختم ہو سکے۔ چنانچہ کون انصاف پسند ایسا ہوگا جو نہ جانتا ہو کہ حضرت ذوالنورینؓ کی مظلومانہ شہادت سے لے کر کربلا کے سانحۂ فاجعہ تک مسلمانوں کی آپس میں جو مسلح آویزش رہی ہے' اس میں درپردہ ان سبائیوں ہی کا ہاتھ تھا۔ مستند تواریخ اس حقیقت پر شاہد ہیں' البتہ ان کو نگاہِ حقیقت بین اور انصاف پسندی کے ساتھ پڑھنا ہوگا۔ جنگِ جمل میں حضرت علیؓ کو فتح ہوئی۔ آنجناب نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ بالکل وہی جو ایک بیٹے کو ماں کے ساتھ کرنا چاہئے۔ چالیس خواتین اور حضرت صدیقہؓ کے لشکر کے معتبر

ترین لوگوں کے ہمراہ پورے ادب واحترام کے ساتھ اُن کو مدینہ منورہ پہنچا دیا۔ معلوم ہوا کہ نہ ذاتی دشمنی تھی نہ بغض وعناد۔ اور اِدھر کیا ہوا؟ معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ' کیا امیر یزید نے خاندانِ رسالتؐ کی خواتین کو اپنی لونڈیاں بنایا؟ آخر وہ دِمشق بھیجی گئی تھیں' لیکن وہاں کیا ہوا؟ ان کا پورا احترام کیا گیا' ان کی دلجوئی کی گئی' ان کی خاطر و مدارات کی گئی۔ امیر یزید نے انتہائی تاسف کا اظہار کیا اور کہا کہ ''ابن زیاد اس حد تک نہ بھی جاتا تو بھی میں اس سے راضی رہ سکتا تھا۔ کاش وہ حسین رضی اللہ عنہ کو میرے پاس آنے دیتا' ہم خود ہی باہم کوئی فیصلہ کر لیتے''۔ لیکن کربلا میں جو کچھ ہوا' وہ اس فتنے کی وجہ سے ہوا جو کوفیوں نے بھڑکایا تھا۔ وہ اپنی دو عملی اور منافقت کی پردہ پوشی کے لئے نہیں چاہتے تھے کہ مصالحت ومفاہمت کی کوئی صورت پیدا ہو۔ ان کو جب محسوس ہوا کہ ہماری سازش کا بھانڈا پھوٹ جائے گا تو انہوں نے وہ صورتِ حال پیدا کر دی جو ایک نہایت دردناک اور الم انگیز انجام پر منتج ہوئی۔

یہ سانحۂ فاجعہ انتہائی افسوس ناک تھا' اس سے کون اختلاف کر سکتا ہے! اس نے تاریخ پر جو گہرے اثر ڈالے ہیں' وہ اظہر من الشّمس ہیں۔ اس کڑوے اور کسیلے پھل کا مزا اُمت چودہ سو سال سے چکھتی چلی آ رہی ہے۔ ان دو واقعات یعنی شہادتِ حضرت عثمان اور شہادتِ حضرت حسین رضی اللہ عنہما کی وجہ سے ہمارے درمیان افتراق' انتشار' اختلاف اور باہمی دست وگریباں ہونے کی جو فضا چلی آ رہی ہے اس پر ان لوگوں کے گھروں میں گھی کے چراغ جلتے ہیں جنہوں نے اس کی بنیاد ڈالی۔ جہاں جہاں اس کے اثرات پہنچے' درحقیقت کامیابی ہوئی ہے ان کو جو دراصل ان فتنوں کی آگ کو بھڑکانے والے تھے۔ اب کوئی یزید کے نام کو گالی بنائے پھرتا ہے' کسی نے شمر کے نام کو گالی بنایا ہوا ہے' کوئی عمرو بن سعد کے نام کو گالی بنائے ہوئے ہے۔ یہاں تک بات پہنچی ہے کہ لوگ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی شان میں بھی توہین آمیز اور گستاخانہ انداز اختیار کرنے سے نہیں چوکتے۔ اللہ تعالیٰ ایسے سب لوگوں کو ہدایت دے اور ہمیں ان میں شامل ہونے سے بچائے اور اپنی پناہ میں رکھے' اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان مبارک کو ہمیشہ مدنظر رکھنے کی توفیق عطا فرمائے کہ:

''اَللّٰہَ اَللّٰہَ فِیْ اَصْحَابِیْ لَا تَتَّخِذُوْھُمْ غَرَضًا مِّنْ بَعْدِیْ فَمَنْ اَحَبَّھُمْ فَبِحُبِّیْ اَحَبَّھُمْ وَمَنْ اَبْغَضَھُمْ فَبِبُغْضِیْ اَبْغَضَھُمْ......''

وآخِرُ دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العلمین

کربلا کی کہانی

حضرت ابو جعفر محمد باقرؒ کی زبانی

ترجمہ: مولانا عطاءاللہ حنیف بھوجیانی

(ماخوذ از ہفت روزہ ''اسلام'' لاہور)

روایت کے راوی عمار دہنی نے کہا کہ میں نے محمد بن علی بن الحسینؒ سے عرض کیا کہ آپ مجھ سے واقعۂ قتلِ حسینؓ ایسے انداز سے بیان فرمائیں کہ گویا میں خود وہاں موجود تھا اور یہ سامنے ہو رہا ہے۔ اس پر حضرت محمد باقرؒ نے فرمایا: امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے انتقال کے وقت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا بھتیجا 'یزید کا چچیرا بھائی ولید بن عتبہ بن ابی سفیان مدینہ منورہ کا گورنر تھا۔ ولید نے حسبِ دستور حضرت حسینؓ کو پیغام بھیجا تا کہ ان سے نئے امیر یزید کے لئے بیعت لیں۔ حضرت حسینؓ نے جواب میں فرمایا کہ سرِ دست آپ سوچنے کی مہلت دیں اور اس بارے میں نرمی اختیار کریں۔ ولید نے ان کو مہلت دے دی۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ مہلت پا کر مکہ معظمّہ تشریف لے گئے۔

دریں اثناء جب کوفہ والوں کو اس کا پتہ چلا کہ حضرتؓ تو مکہ شریف پہنچ گئے ہیں تو انہوں نے اپنے قاصد حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں روانہ کئے اور ان سے درخواست کی کہ آپ کوفہ تشریف لے آئیں' ہم اب آپ ہی کے ہو گئے ہیں۔ ہم لوگ یزید کی بیعت سے منحرف ہیں۔ ہم نے گورنر کوفہ کے پیچھے جمعہ پڑھنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ اس وقت حضرت نعمان بن بشیر انصاریؓ یزید کی طرف سے کوفہ کے گورنر تھے۔ جب اہل کوفہ کی طرف سے اس قسم کی درخواستیں آئیں تو حضرت حسینؓ نے اپنے چچیرے بھائی حضرت مسلم بن عقیلؓ کو کوفہ بھیجنے کا پروگرام بنایا تا کہ وہ وہاں جا کر صورتِ حال کا اچھی طرح جائزہ لیں۔ اگر اہل کوفہ کے بیانات صحیح ہوئے تو خود بھی کوفہ پہنچ جائیں گے۔

حضرت مسلمؓ کی کوفہ کو روانگی

قرارداد کے مطابق حضرت مسلمؓ مکہ شریف سے مدینہ منورہ پہنچے' وہاں سے راستہ کی راہنمائی کے لئے دو آدمی ساتھ لئے اور کوفہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ جس راستہ سے وہ لے گئے' اس میں ایک ایسا لق و دق میدان آ گیا جس میں پانی نہ ملنے کے سبب پیاس سے سخت دوچار ہو گئے۔ چنانچہ اسی جگہ ایک رہنما انتقال کر گیا۔ اس صورتِ حال کے پیش آنے پر حضرت مسلمؓ نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو ایک خط لکھ کر کوفہ جانے سے معذرت چاہی لیکن حضرت ممدوحؓ نے معذرت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور لکھا کہ آپ ضرور کوفہ جائیں۔ بنا بریں حضرت مسلمؓ کوفہ کی طرف چل دیئے۔ وہاں پہنچ کر ایک شخص عوسجہ نامی کے گھر قیام فرمایا۔ جب اہل کوفہ میں حضرت مسلمؓ کی تشریف آوری کا چرچا ہوا تو وہ خفیہ طور پر ان کے ہاں آئے اور ان کے ہاتھ پر حضرت حسینؓ کے لئے بیعت کرنے لگے۔ چنانچہ بارہ ہزار اشخاص نے بیعت کر لی۔ دریں اثنا یزید کے ایک کارندہ عبداللہ بن مسلم بن شعبہ حضرمی کو اس کا پتہ چلا تو اس نے ساری کارروائی کی اطلاع گورنر کوفہ نعمان بن بشیر کو دے دی اور ساتھ ہی کہا کہ یا تو آپ واقعتاً کمزور ہیں یا کوفہ والوں نے آپ کو کمزور سمجھ رکھا ہے' دیکھتے نہیں کہ شہر کی صورتِ حال مخدوش ہو رہی ہے! اس پر حضرت نعمان نے فرمایا کہ میری ایسی کمزوری جو بر بنائے اطاعتِ الٰہی ہو وہ مجھے اس قوت و طاقت سے زیادہ پسند ہے جو اس کی معصیت میں ہو' مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ جس امر پر اللہ تعالیٰ نے پردہ ڈالے رکھا ہے خواہ مخواہ اس پردہ کو

فاش کروں۔اس پر عبداللہ مذکور نے یہ سارا ماجرا یزید کولکھ کر بھیج دیا۔یزید نے اپنے ایک آزاد کردہ غلام سرحون نامی سے اس بارے میں مشورہ لیا۔اس نے کہا''اگر آپ کے والد زندہ ہوتے اور آپ کو کوئی مشورہ دیتے تو اسے قبول کرتے؟''یزید نے کہا'ضرور!سرحون نے کہا' تو پھر میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ کوفہ کی گورنری عبیداللہ بن زیاد کے سپرد کردیں۔ادھر صورتِ حال ایسی تھی کہ ان دنوں یزید عبیداللہ مذکور پر ناراض تھا اور بصرہ کی گورنری سے بھی اسے معزول کرنا چاہتا تھا۔مگر سرحون کے مشورے پر اس نے اظہارِ پسندیدگی کرتے ہوئے بصرہ کے ساتھ کوفہ کی گورنری پر بھی عبیداللہ بن زیاد کو نامزد کر دیا اور لکھ دیا کہ کوفہ پہنچ کر مسلم بن عقیل کو تلاش کرو'اگر مل جائے تو اس کو قتل کردو۔

ابنِ زیاد کوفہ میں اور افشائے راز

اس حکم کی بنا پر عبیداللہ بصرہ کے چند سرکردہ لوگوں کے ہمراہ اس حالت میں کوفہ پہنچا کہ اس نے ڈھاٹا باندھ رکھا تھا تا کہ اسے کوئی پہچان نہ سکے۔وہ اہلِ کوفہ کی جس مجلس سے گزرتا'اس پر سلام کرتا اور وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ سمجھ کر **وعليك السلام يا ابن رسول الله**''اے رسول اللہ ﷺ کے بیٹے'! آپ پر بھی سلام'' سے جواب دیتے۔اسی طرح سلام کہتا اور جواب لیتا ہوا وہ قصرِ امارت پہنچ گیا۔وہاں پہنچ کر اس نے ایک غلام کو تین ہزار درہم دیئے اور کہا کہ تم جا کر اس شخص کا پتہ لگاؤ جو کوفہ والوں سے بیعت لیتا ہے۔لیکن دیکھو تم خود کو''حمص'' کا باشندہ ظاہر کرنا اور یہ کہنا کہ میں بیعت کرنے کے لئے آیا ہوں اور یہ رقم بھی پیش کرنا چاہتا ہوں تا کہ وہ اپنے مشن کی تکمیل میں اس کو صَرف کریں۔چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور بہ لطائف الحیل اس شخص تک اس کی رسائی ہوگئی جو بیعت لینے کا اہتمام کرتا تھا۔اور اس نے اپنے آنے اور امدادی رقم پیش کرنے کی سب بات کہہ ڈالی۔اس نے کہا کہ مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ تمہیں ہدایت کا راستہ نصیب ہوا لیکن یہ محسوس کر کے دکھ بھی ہو رہا ہے کہ ہماری اسکیم ابھی پختہ نہیں ہوئی۔تاہم وہ اس غلام کو حضرت مسلم بن عقیلؓ کے ہاں لے گیا۔حضرت مسلمؓ نے اس سے بیعت بھی لے لی اور رقم بھی اس سے قبول کر لی۔اب وہ یہاں سے نکلا اور عبیداللہ بن زیاد کے پاس سیدھا پہنچا اور سب کچھ اس کو بتلا دیا۔ادھر عبیداللہ کی کوفہ میں آمد کے بعد حضرت مسلم عوسجہ کا گھر چھوڑ کر ہانی بن عروہ مرادی کے مکان پر فروکش تھے اور حضرت حسینؓ کی خدمت میں لکھ بھیجا کہ لوگوں نے بارہ ہزار کی تعداد میں ہماری بیعت کر لی ہے' آپ کوفہ تشریف لے آئیں۔

اور یہاں یہ ہوا کہ جب عبیداللہ کو پتہ چل گیا کہ حضرت مسلمؓ ہانی کے مکان پر ہیں تو اس نے کوفہ کے سرکردہ لوگوں سے کہا کہ کیا بات ہے ہانی میرے پاس نہیں آئے!اس پر حاضرین سے ایک شخص محمد بن اشعث چند ہمراہیوں کے ساتھ ہانی کے ہاں گئے تو وہ اپنے دروازے پر موجود تھے۔ابن اشعث نے کہا کہ گورنر صاحب آپ کو یاد فرماتے ہیں اور آپ کے اب تک نہ حاضر ہونے کو بہت محسوس کرتے ہیں' لہٰذا آپ کو چلنا چاہئے۔چنانچہ ان کے زور دینے پر ہانی ان کے ساتھ ہو لئے اور وہ عبیداللہ کے پاس پہنچے۔اتفاق سے اس وقت قاضی شریح بھی ابن زیاد کے پاس موجود تھے۔ان سے مخاطب ہو کر اس نے کہا' دیکھو اس ہانی کی چال کھوٹ کی مظہر ہے۔پھر اتنے میں وہ اس کے پاس آ گیا تو کہا''ہانی!مسلم بن عقیل کہاں ہیں؟''اس نے کہا' مجھے علم نہیں۔اس پر عبیداللہ نے تین ہزار درہم دینے والے غلام کو اس کے سامنے کر دیا۔ہانی بالکل لاجواب ہو گئے' البتہ اتنا کہا کہ میں نے انہیں اپنے گھر بلایا نہیں بلکہ وہ خود میرے گھر آ کر ٹھہر گئے ہیں۔ابن زیاد نے کہا' اچھا ان کو حاضر کرو۔اس نے اس پر پس و پیش کیا تو ابن زیاد نے ان کو اپنے قریب بلوا کر اس زور سے چھڑی ماری جس سے اس کی بھویں پھٹ گئیں۔اس پر ہانی نے اس کے ایک محافظ سپاہی سے تلوار چھین کر عبیداللہ پر وار کرنا چاہا لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔اس پر ابن زیاد نے یہ کہہ کر کہ اب تمہارا خون حلال ہے' قصرِ امارت کے ایک حصّے میں اس کو قید میں ڈال دیا۔

اس واقعہ کی اطلاع ہانی کے قبیلہ مذحج کو ہوئی تو اس نے قصرِ امارت پر یلغار بول دی۔عبیداللہ نے شور سنا اور پوچھا تو کہا گیا کہ ہانی کا قبیلہ ان کو چھڑانے کے لئے آیا ہے۔اس نے قاضی شریح کے ذریعہ ان کو کہلایا کہ ہانی کو مسلم بن عقیل کا پتہ کرنے اور بعض باتوں کی تحقیق کے لئے روک لیا گیا ہے'

خطرے کی کوئی بات نہیں۔ لیکن ساتھ ہی قاضی شریح پر بھی ایک غلام کو لگا دیا' یہ معلوم کرنے کے لئے کہ وہ لوگوں سے کیا کہتے ہیں! قاضی شریح لوگوں کی طرف جاتے ہوئے ہانی کے پاس سے گزرے تو اس نے قاضی صاحب سے کہا کہ میرے بارے میں اللہ سے ڈرنا' ابن زیاد میرے قتل کے درپے ہے۔ تاہم قاضی شریح نے ہجوم کو ابن زیاد والی بات کہہ کر مطمئن کر دیا' اور لوگ بھی یہ سمجھ کر مطمئن ہو گئے کہ ہانی کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔

حضرت مسلم کو جب ہنگامہ کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے اپنے ذرائع ابلاغ سے کوفہ میں اعلان کرا دیا' جس کے نتیجہ میں چالیس ہزار لوگ ان کے پاس جمع ہو گئے۔ ان کو باقاعدہ انہوں نے ایک فوجی دستہ کی شکل دے دی جس کا مقدمۃ الجیش' میمنہ اور میسرہ وغیرہ سبھی کچھ تھا۔ خود حضرت مسلم بن عقیل اس کے قلب میں ہو گئے۔ اس طرح چالیس ہزار کا یہ لشکرِ جرار قصر امارت کی طرف روانہ ہو گیا۔ عبید اللہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے اہالیانِ کوفہ کو اپنے قصر میں بلایا۔ جب یہ لشکر قصر امارت تک پہنچ گیا تو سردارانِ کوفہ نے پانے اپنے قبیلے کو دیواروں کے اوپر سے گفتگو کر کے سمجھانا شروع کیا۔ اب تو حضرت مسلم کی فوج کے آدمی کھسکنے شروع ہوئے اور ہوتے ہوتے شام تک صرف پانچ سو رہ گئے' حتیٰ کہ رات کے اندھیرے تک وہ بھی چل دیئے۔

جب حضرت مسلمؓ نے دیکھا کہ وہ تنہا رہ گئے ہیں تو وہ بھی وہاں سے چل پڑے۔ راستہ میں ایک مکان کے دروازہ پر پہنچے تو ایک خاتون اندر سے آپ کی طرف نکلی۔ آپ نے اس کو پانی پلانے کے لئے کہا تو اس نے پانی تو پلا دیا لیکن اندر واپس چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد پھر باہر آئی تو آپ کو دروازے پر دیکھ کر اس نے کہا' اے اللہ کے بندے! آپ کا اس طرح بیٹھنا مشکوک ہے' یہاں سے چلے جائیں۔ آپ نے کہا: میں مسلم بن عقیل ہوں' کیا تم مجھے پناہ دو گی؟ اس نے کہا' ہاں آجایئے۔ آپ اندر چلے گئے۔ لیکن کرنا خدا کا یہ ہوا کہ اس عورت کے لڑکے نے محمد بن اشعث مذکور کو اطلاع دے دی جس نے فوراً عبید اللہ تک خبر پہنچائی۔ اس نے اس کے ہمراہ پولیس کو روانہ کر دیا اور ان کو حضرت مسلم کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ پولیس نے جا کر مکان کا محاصرہ کر لیا جب کہ حضرت مسلم کو خبر تک نہ ہو سکی تھی۔ اب خود کو انہوں نے محصور پایا تو تلوار سونت کر نکل آئے اور پولیس کے مقابلے کی ٹھان لی۔ لیکن ابن اشعث نے ان کو روک کر کہا کہ میں ذمہ دار ہوں' آپ محفوظ رہیں گے۔ پس وہ حضرت مسلم کو ابن زیاد کے پاس پکڑ کر لے گئے۔ چنانچہ ابن زیاد کے حکم سے انہیں قصرِ امارت کی چھت پر لے جا کر قتل کر دیا۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون) اور ان کی لاش بازار میں لوگوں کے سامنے پھینک دی گئی۔ نیز اس کے حکم سے ہانی کو کوڑے کرکٹ کی جگہ تک گھسیٹتے ہوئے لے جا کر سولی دے دی گئی—— ادھر تو کوفہ میں یہ تک ہو گیا تھا اور......

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی کوفہ روانگی

اُدھر حضرت مسلم چونکہ خط لکھ چکے تھے کہ بارہ ہزار اہل کوفہ نے بیعت کر لی ہے' حضرت حسینؓ جلد از جلد تشریف لے آئیں اس لئے حضرت حسین رضی اللہ عنہ مکہ شریف سے کوفہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ تا آنکہ آپ قادسیہ سے تین میل کے فاصلے پر تھے کہ حُر بن یزید تمیمی حضرت حسینؓ کے قافلہ کو ملا۔ اس نے کہا' کہاں تشریف لے جا رہے ہو۔ آپ نے فرمایا' کوفہ۔ اس نے کہا کہ وہاں تو کسی خیر کی توقع نہیں' آپ کو یہاں سے ہی واپس ہو جانا چاہئے۔ پھر کوفیوں کی بے وفائی اور حضرت مسلم کے قتل کی پوری روداد آپ کو سنائی۔

سارا قصہ سن کر حضرت حسینؓ نے تو واپسی کا ارادہ کر لیا لیکن حضرت مسلم کے بھائیوں نے یہ کہہ کر واپس جانے سے انکار کر دیا کہ ہم خونِ مسلم کا بدلہ لیں گے یا خود مارے جائیں گے۔ اس پر حضرت حسینؓ نے فرمایا' تمہارے بغیر میں جی کر کیا کروں گا۔ اب وہ سب کوفہ کی طرف روانہ ہوئے۔ جب آپ کو ابن زیاد کی فوج کا ہراول دستہ نظر آیا تو آپ نے ''کربلا'' کا رُخ کر لیا اور وہاں جا کر ایسی جگہ پڑاؤ ڈالا جہاں ایک ہی طرف سے جنگ کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ خیمے نصب کر لئے۔ اس وقت آپ کے ساتھ پینتالیس سوار اور سو کے قریب پیدل تھے۔

دریں اثناء عبید اللہ نے عمرو بن سعد کو جو کوفہ کا گورنر تھا' بلایا اور اس سے کہا کہ اس شخص کے معاملے میں میری مدد کریں۔ اس نے کہا' مجھے تو معاف

ہی رکھئے۔ابن زیاد نہ مانا۔اس پر عمرو بن سعد نے کہا ''پھر ایک شب سوچنے کی مہلت تو دے دیجئے۔'' اس نے کہا' ٹھیک ہے' سوچ لو۔ابن سعد نے رات بھر سوچنے کے بعد آمادگی کی اطلاع دے دی۔

اب عمرو بن سعد حضرت حسینؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔حضرت نے اس کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ دیکھو تین باتوں میں سے ایک بات منظور کر لو: (۱) یا مجھے کسی اسلامی سرحد پر چلے جانے دو' (۲) یا مجھے موقعہ دو کہ میں براہِ راست یزید کے پاس پہنچ جاؤں (۳) اور یا پھر یہ کہ جہاں سے آیا ہوں وہیں واپس چلا جاؤں۔

ابن سعد نے یہ تجویز خود منظور کر کے ابن زیاد کو بھیج دی۔اس نے لکھا' ہمیں یہ منظور نہیں ہے' (بس ایک ہی بات ہے کہ) حسینؓ (یزید کے لئے) میری بیعت کریں۔ابن سعد نے یہی بات حضرت حسین رضی اللہ عنہ تک پہنچا دی۔انہوں نے فرمایا' ایسا نہیں ہوسکتا۔اس پر آپس میں لڑائی چھڑ گئی اور حضرت کے سب ساتھی (مظلومانہ) شہید ہو گئے' جن میں دس سے کچھ اوپر نوجوان ان کے گھر کے تھے۔اسی اثناء میں ایک تیر آیا جو حضرت کے ایک چھوٹے بچے کو لگا جو گود میں تھا۔آپ اس سے خون پونچھ رہے تھے اور فرما رہے تھے ''اے اللہ! ہمارے اور ایسے لوگوں کے بارے میں فیصلہ فرما جنہوں نے پہلے یہ لکھ کر ہمیں بلایا ہے کہ ہم آپ کی مدد کریں گے۔پھر اب وہی ہمیں قتل کر رہے ہیں''۔اس کے بعد خود تلوار ہاتھ میں لی' مردانہ وار مقابلہ کیا اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے! رضی اللہ عنہ۔اور یہ شخص جس کے ہاتھ سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ شہید ہوئے قبیلہ مذحج کا آدمی تھا' اگرچہ اس بارے میں دوسرے اقوال بھی تاریخوں میں مذکور ہیں۔

مذحج ہانی کا وہی قبیلہ تھا جس نے قصرِ امارت پر چڑھائی کر دی تھی۔یہ شخص حضرت کا سر تن سے جدا کر کے ابن زیاد کے پاس لے گیا۔اس نے ایک شخص کو آپ کا سر مبارک دے کر یزید کے پاس بھیج دیا' جہاں جا کر یزید کے سامنے رکھ دیا گیا۔ادھر ابن سعد بھی حضرت کے گھر دار کو لے کر ابن زیاد کے پاس پہنچ گیا۔ان کا صرف ایک لڑکا بچا رہ گیا تھا اور وہ بچہ علی بن الحسینؓ زین العابدین تھے' جو روایت کے راوی ابوجعفر الباقر کے والد تھے۔یہ عورتوں کے ساتھ اور بیمار تھے۔ابن زیاد نے حکم دیا' اس بچے کو بھی قتل کر دیا جائے۔اس پر ان کی پھوپھی حضرت زینبؓ بنت علیؓ اس کے اوپر گر پڑیں اور فرمایا کہ جب تک مَیں قتل نہ ہو جاؤں گی اس بچے کو قتل نہ ہونے دوں گی۔اس صورتِ حال کے نتیجے میں ابن زیاد نے اپنا یہ حکم واپس لے لیا اور بعد میں اسیرانِ جنگ کو یزید کے پاس بھیج دیا۔

جب حضرت حسینؓ کے یہ بچے کھچے افرادِ خانہ یزید کے دربار میں پہنچے تو چند درباریوں نے حسبِ دستور یزید کو تہنیت فتح پیش کی۔ان میں سے ایک شخص نے یہاں تک جسارت کر ڈالی کہ ایک لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا ''امیر المؤمنین! یہ مجھے دے دیجئے''۔یہ سن کر حضرت زینبؓ بنت علیؓ نے کہا ''بخدا! یہ نہیں ہوسکتا' بجز اس صورت کے کہ یزید دینِ الٰہی سے نکل جائے''۔پھر اس شخص نے دوبارہ کہا تو یزید نے اُسے ڈانٹ دیا۔

اس کے بعد یزید نے ان سب کو محل سرا میں بھیج دیا۔پھر ان کو تیار کرا کے مدینہ روانہ کروا دیا۔جب یہ لوگ مدینہ پہنچے تو خاندانِ عبدالمطلب کی ایک عورت سر پیٹتی اور روتی ہوئی ان سے ملنے کے لئے آئی اور اس کی زبان پر یہ اشعار تھے ؎

ماذا تقولون ان قال النبی لکم   ماذا فعلتم وانتم اخر الامم

بعترتی وباھلی بعد مفتقدی   منھم اساریٰ وقتلی ضرجوا بدم

ماکان ھذا جزائی اذ نصحت لکم   ان تخلفو فی بشر فی ذوی رحمی

(اس روایت کو حافظ ابن حجر العسقلانی نے ''تہذیب التہذیب'' میں نقل کیا ہے)